ہماری ویب ڈیجیٹل بک

راجہ محمد عتیق افسر

RAJA MUHAMMAD ATTIQUE AFSAR

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

SOCIETY & CULTURE

E-BOOK SERVICES
Collection of Published Articles
By "Raja Muhammad Attique Afsar"
at Hamariweb.com

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

ایک بطلِ جلیل

شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ یہ تاریخ ساز جملہ شیر میسور کا آخری خطاب ہے جو اس نے اپنے ان چاہنے والوں سے کیا جو اسے زندہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کے دن عیار دشمن کے ساتھ گھمسان کی جنگ میں وہ سورج ہمیشہ کے لیے گہنا گیا جس کی کرنوں نے برصغیر میں آزادی کے شجرِ سایہ دار کو جلا بخشی تھی۔ ریاست میسور کا یہ شیر ایک مجاہد حکمران حیدر علیؒ کے گھر پیدا ہوا۔ اس شہزادے کا بچپن کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے جانبازی کی مشقیں کرنے میں گزرا۔ جوانی میں جنگ کے میدانوں میں شجاعت کے جوہر دکھاتا اور فتح کے علم لہراتا رہا، عنان حکومت سنبھالی تو داخلی و خارجی محاذوں سے کامیابی سے نبرد آزما ہوا۔ عیش و عشرت کے بجائے خدمت عوام کو مقدم جانا۔ شیروں کی طرح جیا اور جب موت نے آواز دی تو اسے بھی شکست دیتے ہوئے دیوانہ وار جام شہادت پی کر ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔

ہمہ پہلو شخصیت

سلطان فتح علی خان ٹیپوؒ ایک جری سپاہی، صاحب تدبیر جنرل، عوام دوست

حکمران، بہتریں منتظم، شاعر، ادیب، فلسفی اور موجد نومبر ۱۷۵۰ء میں ایک مجاہد حکمران حیدر علی کے گھر پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی صاحب لیاقت ہونے کی وجہ سے کم عمری ہی میں وہ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، اردو، تامل اور کنڑی جیسی زبانوں پہ دسترس حاصل کر گیا۔اس نے علوم اسلامیہ، ریاضی اور سائنس میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ فنِ حرب و ضرب، سپہ گری، تیر افگنی، نیزہ بازی، تفنگ اندازی، تیراکی میں بھی کما حقہ کمال حاصل کیا۔اسکے ساتھ ساتھ اس نے یورپی طرزِ حرب و ضرب سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ شہادت کے وقت اس کی ذاتی لائبریری میں مختلف زبانوں میں ۲۰۰۰ سے زائد کتب موجود تھیں۔

سرفروش مجاہد جانباز سپاہی

سلطان ٹیپوؒ بچپن سے ہی فن سپہ گری کا ماہر ہو گیا تھا۔جوانی میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنی سپاہیانہ مہارت کا لوہا منوا لیا۔ کم عمری ہی میں اپنے والد حیدر علی کا دست راست بن کر جنگ کے میدانوں مین دشمن پہ اپنی دھاک بٹھا دی۔اسکے بدترین دشمن انگریز تو اس کے نام تک سے اس قدر خائف تھے کہ انگریز مائیں اپنے روتے بچوں کو چپ کرانے کے لیے کہا کرتیں:

`Tipu has come; be silent' "چپ ہو جاؤ ٹیپو آ رہا ہے"۔

وہ تلوار کا دھنی تھا اور ہمیشہ تلوار سے محبت رکھتا تھا۔اس نے تلوار سے وفا نبھائی۔ جسم سے روح کا تعلق ختم ہو جانے کے بعد بھی تلوار کے دستے سے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ شہادت کے بعد اس کی لاش دوسری لاشوں کے درمیان دب گئی۔ جب لاش کی پہچان مشکل ہو گئی تو خود انگریز جنرل نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ: ''اسکی لاش کو تلاش کرو وہ بہادر اور تلوار سے محبت رکھنے والا شخص تھا مر تو سکتا ہے مگر تلوار نہیں چھوڑ سکتا۔ جس لاش کے ہاتھ میں تلوار ہو گی وہی ٹیپو کی لاش ہو گی۔''

چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ واقعتاً تلوار اسکے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔زندگی نے اس سے وفا نہ کی مگر اس نے تلوار سے وفا کی نئی ریت قائم کر لی۔

سلطان کی دھاک انگریزوں پہ ایسی بیٹھی کہ وہ اسکے سائے سے بھی خوفزدہ تھے۔ ۱۷۹۲ء کی جنگ میں انگریز نے نظام اور مرہٹہ کے تعاون سے ٹیپو کو شکست دی۔ اس موقع پر انگریز سرنگا پٹم کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے مگر سلطان کی ہیبت ان پہ ایسی طاری تھی کہ انہوں نے صلح کر کے چل دینے میں ہی عافیت جانی۔

نصب العین سے جڑا انسان

سلطان ٹیپوؒ ایک دور اندیش سوچ کا حامل تھا وہ تاجر کے روپ میں برصغیر آئے انگریزوں کی یہاں کے تخت و تاج پہ لگی نظروں کو بھانپ گیا تھا۔انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی بڑی سرعت کے ساتھ سرمایہ کاری کرتے ہوئے برصغیر کے با اثر دل و دماغ خرید رہی تھی جو اس امر کی غماز تھی کہ اگر ضمیر و ایمان فروشی کی اس تجارت کے سامنے بند ھ نہ باندھا گیا تو عنقریب برصغیر کے تمام تر وسائل پر اہل یورپ قابض ہو جائیں گے اور اس خطے کے لوگ بدترین غلامی میں جھونک دیے جائیں گے۔سلطانؒ نے اپنے والد حیدر علیؒ کی طرح اپنی زندگی کو ایک ہی مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا اور وہ تھا اپنی سرزمین کو غیر ملکی استعمار کے ناپاک عزائم سے پاک کرنا، بیرونی جارحیت کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن کر مزاحمت کرنا اور مردانہ وار مقابلہ کرنا۔

صاحب تدبیر جرنیل

اپنے مشن کے ساتھ والہانہ وابستگی اور اسکے حصول کے لیے تندہی سے جدوجہد کی وجہ سے فتوحات نے کم عمری ہی میں سلطانؒ کے قدم چومنا شروع کر دیے۔وہ ۱۷۶۵ء میں پہلی بار صرف ۱۵ برس کی عمر میں سامنے آیا، مالابار پہ حملہ آور ہوا اور محض دو تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ اس نے دشمن کے بڑے لشکر کو حراست میں لے لیا۔اس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔وہ ہر بار ایک نئی حکمت

عملی اور انوکھی چال کے ساتھ میدان میں اترا اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے۔
۱۷۶۹ء میں وہ منگلور میں انگریز فوج کے مقابل آیا۔ اس کے پاس جنگی ساز و سامان کی قلت تھی مگر اس نے ایسی جنگی چال چلی کہ انگریز سپاہ کو کیل کانٹے کی برتری ہونے کے باوجود حواس باختہ ہو کر پیٹھ دکھانے پہ مجبور کر دیا۔ اس نے ۲۰ہزار سپاہیوں کو لکڑی کی بندوقیں ہاتھ مین تھما کر انگریز توپخانے کے سامنے لا کھڑا کیا اور خود فوج کے دستوں کے ہمراہ انگریز لشکر پہ ٹوٹ پڑا۔ انگریزوں کو زبردست شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسی طرح ۱۷۸۰ء میں کرنل بیلی کو شکست دے کر اسے گرفتار کر لیا اس ضرب کاری نے انگریز کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس طرح نظام اور مرہٹہ کی افواج کو بھی ناکوں چنے چبوائے اور دیگر باغیوں کے ساتھ بھی آہنی ہاتھوں سے نمٹا۔

عوام دوست حکمران

سلطان ٹیپوؒ مرد آہن ہونے کے باوجود دیگر سلاطین کی طرح جہانگیری کا طلبگار نہ تھا۔ اس نے اقتدار سنبھالتے ہی عوام کی فلاح و بہبود کو مقدم جانا اور اس کے لیے عملی اقدامات کیے۔ اس نے نیا کیلنڈر جاری کیا، نئے حکومتی شعبہ جات قائم کیے اور ہر ایک کے لیے امیر مقرر کیا۔ نئے سکے کا اجراء ہوا جس پہ سلطنتِ میسور کی چھاپ تھی۔ اس نے زرعی ملک ہونے کے ناطے زراعت پہ خاص توجہ

دی۔ زرعی اصلاحات نافظ کیں اور دریائے کاویری پہ ڈیم بنوایا۔
صنعت و تجارت کو فروغ دیا۔ تجارتی بیڑا بنایا اور دیگر ممالک سے تجارت شروع کی۔
جہاز سازی کی صنعت شروع کی۔ اسکے علاوہ ریشم اور گھڑی سازی کی صنعت کو بھی
فروغ دیا۔ فوجی نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے قوانین بنائے، فوجی قوائد وضوابط پہ
کتاب لکھی۔ فوج کو منظم کیا، اسکی رجمنٹیں بنائیں اور تنخواہیں مقرر کیں۔ فوج کی جدید
خطوط پہ تربیت کی غرض سے فرانسیسی ماہرین سے استفادہ کیا اور فرانسیسی فوجیوں کو اپنی
فوج کا حصہ بنایا۔
سلطانؒ فرانسیسی طرز کا جمہوری نظام ملک میں متعارف کرانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس
نے اختیارات وزراء کو منتقل کیے تھے مگر شاید یہ قوم اس وقت اس کے قابل نہ تھی۔
وزراء کو اختیارات کی بہتات ہضم نہ ہوئی اور ان کے غلط استعمال نے نہ صرف ملک کو
ایک بہترین حکمران سے محروم کیا بلکہ اس ملک کی نسلوں کو بھی غلامی کے اندھیروں
میں جھونک دیا جس سے ہم تاحال نکل نہ سکے۔
بیدار مغز حکمران
سلطان ٹیپوؒ نے نا مساعد حالات میں عنانِ حکومت سنبھالی تھی اس وقت ایک طرف

تو وہ خارجی عناصر کا مقابلہ کر رہا تھا تو دوسری جانب اسے اندرونی انتشار اور سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے اپنی فہم وفراست سے کام لیا اور انگریز سامراج سے مقابلہ کرنے کے لیے بین الاقوامی حکمتِ عملی ترتیب دی۔ اس کی کوشش تھی کی تمام عالمِ اسلام کو انگریز کے خطرے سے آگاہ کیا جائے اور ملت اسلامیہ باہمی اتحاد و اتفاق سے اس عفریت کا مقابلہ کرے۔ اس ضمن میں اس نے عثمان خان کی قیادت میں خلافت عثمانیہ کی طرف سفارت بھیجی جو حوصلہ افزا رہی۔اسکے بعد میر غلام علی کی قیادت میں سفارتی وفد بھیجا۔ خلافت عثمانیہ نے سلطان کو پروانۂ سلطنت جاری کیا۔اسی طرح افغانستان اور ایران کی آزاد حکومتوں کی جانب بھی سفارتی وفود بھیجے جنھوں نے حوصلہ افزا نتائج برآمد کیے۔

جن دنوں سلطان ٹیپوؒ انگریزوں کے دانت کھٹے کر رہا تھا انہی دنوں فرانس کا نپولین بھی انگریز کے مقابلے میں مرد آہن بنا ہوا تھا۔ سلطان نے انگریز کے دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ فرانس کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کیے۔ اپنی فوج میں فرانسیسی افسران تعینات کیے تاکہ فوج کو یورپی طرز جنگ کیمطابق تربیت دی جائے۔نپولین سے فوجی تعاون کا معاہدہ بھی کیا جس کے مطابق مصر میں انگریز سامراج کو شکست دینے کے بعد فرانسیسی افواج نے میسور کی فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں کا قلع قمع کرنا تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا کیونکہ فرانس کو دیگر محاذوں پہ شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اسکے علاوہ سلطانؒ نے اپنی ہمسایہ ریاستوں سے اچھے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی اور یہ باور کرانے کی بارہا کوشش کی کہ آپس کے اختلافات مٹا کر بیرونی سامراج کا مقابلہ کیا جائے۔مگر مال وزر نے انہیں انگریز کا زرخرید بنا رکھا تھا۔ان کی آنکھوں پہ بندھی ہوس کی پٹی نے اس روشنی کو انکی سیاسی بصیرت پہ پڑنے سے روکے رکھا۔اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کا مقابلہ کرنے کے لیے سلطانؒ اکیلا رہ گیا۔لیکن اقتدار نے ان عاقبت نااندیش حکمرانوں سے بھی وفا نہ کی اور تمام ہندوستان انگریز کی بدترین غلامی میں جکڑا گیا۔

مرد مؤمن مرد حق

سلطان ٹیپوؒ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔وہ دینِ اسلام کو ساتھ سچا لگاؤ رکھتا تھا۔دین اسلام کے فروغ کیلیے اس نے عملی اقدامات اٹھائے۔وہ پسند نہیں کرتا تھا کہ لوگ تعظیما اسکے آگے جھکیں اس لیے اس نے اپنی تعظیم میں جھکنا منع کر رکھا تھا۔اسی طرح اس نے عورتوں کے لیے پردے اور چادراوڑھنے کا حکم دے رکھا تھا۔دعوتی مہمات کے ذریعے لاکھوں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔اپنے گورنر بدرالزماں کو لکھے ایک مراسلے میں سلطانؒ رقمطراز ہے کہ۔'' میں نے مالابار میں بڑی فتح حاصل کی ہے اور چار لاکھ سے زائد افراد نے اسلام قبول کر لیا ہے۔''

تعلیم کے لیے اردو اور فارسی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔حکومتی اداروں میں عربی مصطلحات کو رواج دیا گیا۔جیسے ''خطا''، ''سند''، اور ولدیت کے لیے ''بن'' کا استعمال وغیرہ۔شہروں کے نام اسلامی طرز پہ رکھے جیسے دیوانہلی کو یوسف آباد، میسور کو ناصرآباد، دندیگل کو خالق آباد اور کالی کٹ کو اسلام آباد کے ناموں سے موسوم کیا۔

مذہبی رواداری کا پیکر

سلطان دین اسلام سے گہری محبت رکھتا تھا مگر اس نے دیگر مذاہبِ عالم کے ساتھ رواداری کا عملی ثبوت دیا اور ملک میں ہم آہنگی کی فضا قائم کی۔اس نے میسور کی حکومت میں ھندو وزراء تعینات کیے۔ملازمتوں میں ہندوؤں کو بھرپور حصہ دیا۔اس نے ہندو مندروں کی تعمیر و مرمت کے لیے رقوم جاری کیں۔مذہبی عبادت گاہوں کے لیے وظائف مقرر کیے اور مذہبی پیشواؤں کو تحائف سے نوازا۔میسور میں پہلا چرچ سلطان ٹیپوؒ نے خود تعمیر کرایا جس کا مقصد فرانسیسی قوم کے ساتھ پائدار تعلقات استوار کرنا تھا۔

موجد و مخترع

جو شخص اپنے مقصد سے قلبی وابستگی اور لگاؤ رکھتا ہو وہ اسکے حصول کے لیے

راہیں تلاش کرتا رہتا ہے۔ اور اگر وہ علم و دانش سے مسلح ہو تو پھر ستاروں پہ کمندیں ڈال دیتا ہے۔ انگریز استعمار کے خلاف مزاحمت اور انہیں برصغیر سے نکال باہر کرنے کے مقصد کے ساتھ جنون کی حد تک لگاؤ نے سلطان کو موجد و مخترع بنا دیا۔

سلطان ٹیپوؒ نے میزائل ٹیکنالوجی کی بنیاد رکھی۔ یہ میزائل فولادی تلوار یا خنجر کی ہیئت کے ہوتے جن کے دستے کی جگہ فولادی نلی ہوتی تھی۔ اس نلی میں بارود بھرا ہوتا تھا۔ فتیلے کے ذریعے انہیں آگ دکھائی جاتی تو یہ اڑتی تلواریں دشمن پہ جا برستیں اور شدید جانی و مالی نقصان کرتیں۔ اسکے لیے فوج میں علیحدہ بریگیڈ (کشون) کے نام سے قائم تھا۔ جسکے مختلف دستوں میں ہمیشہ ۱۵۰۰ سے ۶۰۰۰ تربیت یافتہ اور ماہر سپاہی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ میزائل دو کلومیٹر تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انگریزوں نے اس افتاد کا سامنا اس سے قبل کبھی نہ کیا تھا۔ ٹیپو سلطان کو میزائل ٹیکنالوجی کے موجد کا اعزاز حاصل ہے۔

دفاع وطن کے لیے بحریہ (نیوی) کی اہمیت مسلّم ہے۔ سلطان نے دفاعی استعداد بڑھانے کے لیے بحری بیڑا تشکیل دیا جس کا امیر البحر مقرر کیا۔ امیر البحر کے تحت مشاق کمانڈروں کی ایک کونسل ہوتی تھی۔ اسکے بحری بیڑے میں ۱۳۵/ توپوں

سے مسلح ۴۰ چھوٹے بڑے بحری جہاز شامل تھے۔ ہندوستان میں بحری بیڑا سلطان ٹیپوؒ کی اختراع تھی۔

سلطانؒ نے سمندری جہازوں کو مقناطیسی چٹانوں کے اثرات سے تباہ ہونے سے بچانے کے لیے لوہے کی جگہ تانبے سے تیار کردہ پیندے کا استعمال کروایا۔اس طرح تانبے کے پیندے والے جہاز بھی سلطان ٹیپوؒ کی ایجاد ہے۔

اگر سلطان ٹیپوؒ جیسے حکمران کو مزید وقت ملتا تو شاید دنیا کچھ اور ایجادات سے مستفید ہوتی ، چاند پہ انسانی قدم بہت پہلے رکھا جا چکا ہوتا اور آج انسان ستارون پہ کمندیں ڈال رہا ہوتا۔

کردار کا غازی

اپنے معاصر حکمرانوں پر سلطان ٹیپوؒ کو اخلاقی برتری حاصل تھی ۔ وہ قول کا سچا ، ایفائے عہد کا پابند، محب وطن ، خوددار اور سپاہیانہ کردار کا حامل تھا۔وہ شراب وکباب اور عیش و عشرت سے دور بھاگتا تھا اسی لیے اس کے دل و دماغ کو نہ کوئی مرعوب کر سکا نہ ہی مرغوب۔ ۱۷۹۲ء میں سلطانؒ کو انگریز اور انکے اتحادیوں سے ہزیمت اٹھانا پڑی جس میں اسکا نصف ملک دشمن کے قبضے میں چلا گیا۔ اسے مالی تاوان بھی ادا کرنا پڑا۔

ملک اقتصادی بدحالی کے قریب

ہو گیا مگر سلطانؒ نے اس صورتحال میں بھی کچکول پھیلا کر غیروں سے بھیگ مانگنے کے بجائے خودداری اور ہمت سے کام لیا اور صرف ۵ برس میں مالی بحران کا قلع قمع کر دیا اور اپنی جنگی استعداد کار کو دوبارہ اس قابل بنا دیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جا سکے۔ کاش کہ ہمارے موجودہ حکمران بھی خودداری اور حمیت کی لاریب حقیقت سے آشنا ہو جائیں

۔

سلطان، نیپولین کا ہم عصر تھا۔ دونوں انگریز سامراج کے لیے خارِ گلو بنے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کی دہشت انگریز پہ طاری تھی۔ دونوں انگریز سامراج کے خلاف چٹان کی صورت مزاحم تھے۔ آخری دِنوں میں دونوں کے گرد انگریزوں نے محاصرہ تنگ کر دیا اور دونوں کو اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ خود کرنا پڑا۔ مگر دونوں کا انجام کار مختلف رہا۔ جب نیپولین کے خلاف گھیرا تنگ ہوا تو اس نے جان کی امان پا کر ہتھیار ڈال دیے اور انگریز کی قید میں جینے کو ترجیح دی۔ اسکی موت انگریز کی قید میں واقع ہوئی۔ جبکہ سلطان ٹیپوؒ کو آخری وقت میں دورانِ جنگ ایک جان نثار نے کہا کہ حضور آپ ہتھیار ڈال دیجئے آپ کی جان بچ جائیگی۔ مگر سلطان نے اس وقت بھی ایک تاریخی فقرہ کہا جو اسے ہمیشہ کے لیے امر کر گیا۔ سلطان کا آخرہ فقرہ تھا: ''شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' اس نے غلامی و ذلت کی زندگی پہ عزت کی موت کو ترجیح دی۔ بقول شاعر

کیا سوچ کے بنائیں شاخِ گل پہ آشیاں اپنا

چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

نیپولین کو مغربی دنیا میں ایک حکیم کی حیثیت سے کافی پزیرائی ملی اور اسکے اقوال و فرمودات حکمت و فلسفے کا خزانہ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن نیپولین کے تمام تر اقوال و حکایات کو جمع کرکے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسری جانب سلطان کا آخری مقولہ رکھا جائے تو بلا شبہ سلطان کا پلڑا بھاری رہے گا۔ کیونکہ سلطان نے جو کہا خود کرکے دکھایا۔ایک مرد مومن کی شان ہے کہ وہ اپنی اخلاقی برتری ہر حال میں برقرار رکھتا ہے۔

دانائے راز

سلطان ٹیپوؒ نے دنیا سے جاتے جاتے قوم کو ایک فلسفہ حیات دے دیا۔ جو اسکے آخری جملے سے ظاہر ہوتا ہے۔اور وہ نہایت آسان فہم مگر مشکل العمل ہے۔ یعنی اپنی آزادی و خودمختاری کا ہر قیمت پہ دفاع کرو۔ خود داری اپناؤ اور دوسروں کی غلامی ہر گز قبول نہ کرو کیونکہ بے کار زندگی ہے سہاروں کی زندگی۔

سو چا ہے قتیل اب کچھ بھی ہو ہر حال میں اپنا حق لیں گے

عزت سے جیے تو جی لیں گے یا جام شہادت پی لیں گے۔

یہ پیغام ہے ہمارے موجودہ حکمرانوں کے لیے کہ وہ اپنے مفادات کے لیے اغیار

کی چالوں میں نہ آئیں اور ان کا کھلونا نہ بنیں بلکہ اپنی ملی حمیت اور قومی وقار کی خاطر اگر جان بھی دینا پڑے تو اسکی پروا نہ کریں۔اپنے ملکی وقار کو گروی رکھ کر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ کسی عالمی طاقت کی ایک ہی ٹیلیفون کال پہ ڈھیر نہ ہو جائیں ،نہ ہی اپنے ملک کے باسیوں کے قتل ناحق کی اجازت دیں اور نہ ہی اپنی سرحدات کو عبور کرنے کی کسی کو اجازت دیں بلکہ ڈٹ کر سامراج کا مقابلہ کریں۔

اس جملے میں زندگی کا ایک قیمتی راز پنہاں ہے۔اسی جملے کو علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے اور سلطان ٹیپوؒ کی وصیت کے نام سے نظم لکھی ہے جو سلطان کے پیام زندگی کا حاصل بحث ہے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلٰی بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب !بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
محفل گداز ! گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبح ازل مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول
وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

سلطان ٹیپو مردِ میدان تھا وہ جنگ کے میدانوں میں نا قابل تسخیر رہا۔اسے دنیاوی طاقتیں اپنے آگے سرنگوں نہیں کر سکی۔وہ چٹان بنا آندھیوں اور طوفانوں کو روکتا رہا،اور بند ھ بنا طغیانی کو روکتا رہا۔اگر اسے تقدیر سے کچھ مہلت مزید مل جاتی تو شاید برصغیر کی سیاسی تقدیر میں غلامی کا بدنما دھبہ کبھی نہ لگتا۔ مگر جس قوم کے چند ضمیر فروشوں نے ملت کے لہو کا سودا کر لیا ہو اس قوم کو غلامی کی تاریکیوں میں گم ہو جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ہمارے قلعوں کو کوئی بھی فاتح باہر سے فتح نہیں کر سکا افسوس صد افسوس کہ ہمارے قلعے ہمیشہ اندر سے کھلے۔جہاں کردار کے غازی ہوتے ہیں وہاں ایمان فروش بھی اپنے مردہ ضمیر کی دکان سجائے بیٹھے رہتے ہیں۔شیر کی کچھار کے قریب گیدڑ بھی اس تاک میں ہوتے ہیں کہ کب شیر آنکھوں سے اوجھل ہو اور یہ اس کے پس خوردہ سے لطف اٹھائیں۔سلطان نے جن وزراء پہ اعتماد کر کے انہیں اختیارات تفویض کیے انہی نے آستیں کا سانپ بن کر ڈھسا۔میر صادق اور پورنیا جیسے وزراء نے سازشوں کے جو جال بچھائے سلطان ان کی نذر ہو کر اپنی عاقبت سنوار گیا۔ان ایمان فروشوں کے ہاتھ ذلت کے سوا کچھ نہ آیا فائدہ انگریز

سامراج کو ہوا جو کچھ ہی عرصے میں بلا شرکتِ غیرے تمام برصغیر پہ قابض ہو گیا۔ انگریز نہیں چاہتے تھے کہ دوبارہ اس نوع کی شخصیت سے ان کا سامنا ہو لہٰذا انہوں نے برصغیر پہ تسلط کا سپنا پورا ہونے کے بعد اقتدار کو طول دینے کے لیے معاشرے کو تقسیم در تقسیم کر دیا۔تاکہ لوگ خود ایک دوسرے کا استحصال کرتے رہیں اور یہاں کے وسائل سے انگریز فائدہ اٹھاتے رہیں۔انہوں نے دوسری جانب لارڈ میکالے کا وضع کردہ نظام تعلیم رائج کیا جس کا مقصد تعلیمی اداروں کو ایسی نرسریاں بنانا تھا جہاں میر صادق اور میر جعفر کی پنیریاں تیار کر سکیں۔وہ اس مقصد میں کامیاب بھی رہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ یہی میر صادق و میر جعفر ہر شعبۂ زندگی میں اپنے مردہ ضمیر چند ٹکوں میں فروخت کر کے ملک و ملت کی رگوں کا لہو چوس رہے ہیں۔کہیں راشی افسران کی صورت میں، کہیں طالع آزما جرنیلوں کی صورت میں، کہیں نا اہل حکمرانوں کی صورت میں اپنے قومی مفاد کا سودا کرتے نظر آتے ہیں۔ملی حمیت کا پاس کیے بغیر ایک ہی اشارے پہ اپنی سرزمیں تک دشمن کے حوالے کر دیتے ہیں۔کچکول لیے دیار غیر جاتے ہیں اور اپنی قوم کو گروی رکھ کر اپنے لیے آب و دانہ کا اہتمام کرتے ہیں۔

اگر ہم باوقار زندگی جینا چاہتے ہیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ انگریز کے وضع

کردہ نظام زندگی کو یکسر تبدیل کرکے اپنی اقدار پہ مشتمل نظام زندگی قائم کریں تب ہی
ہم سلطان ٹیپوؒ کی وصیت پہ عمل پیرا ہو کر دنیا میں اپنے زندہ و آفاقی کردار کا لوہا منوا
سکیں گے بصورت دیگر ہماری داستاں تک نہ ہو گی داستانوں میں ۔۔۔۔۔

آئندہ حکومت کو درپیش داخلی و خارجی چیلنجز

اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان میں جمہوری حکومت پانچ سال کی آئینی مدت مکمل کر چکی اب نگران حکومت ااانتخابات کے بعد اقتدار نو منتخب حکومت کے حوالے کرے گی۔ یہ امر انتہائی خوش آئند ہے کہ انتقال اقتدار ایک پر امن اور جمہوری ماحول میں ہونے جا رہا ہے۔پاکستان میں جمہوریت ایک خواب کی مانند ہے کیوں کہ یہاں جمہوری رویوں کو پنپنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ طاقت نے مختلف روپ دھار کر ایوان اقتدار پہ قبضہ کیا کبھی افسر شاہی (Bearucracy) ، کبھی فوجی جرنیلوں کبھی جاگیرداروں اور کبھی کٹھ پتلی حکمرانوں کی صورت میں یہ لوگ عوامی امنگوں کا خون کرتے رہے۔ اسکی وجہ طاقتور اداروں کی بلا وجہ سیاست میں مداخلت بھی ہے اور خود سیاست دانوں کا مسخ کردار بھی۔ بہر حال ملک اب جمہوریت کی پٹری پہ رواں ہو چکا ہے اگر کچھ عرصہ اسے چلنے دیا جائے تو سیاسی نظام مضبوط اور مستحکم ہو جائے گا۔ انتقال اقتدار خوش آئند ہے اور لوگ پر امید ہیں کہ یہ انتخابات تبدیلی کی لہر ثابت ہوں گے۔ موجودہ حکومت نے اپنی نا اہلی کے باعث جو مسائل پاکستان کو عطا کیے ہیں وہ بھی ان انتخابات کے نتیجے میں آئندہ حکومت کو منتقل ہو جائیں گے۔آئندہ حکومت کے لیے ان مسائل سے نبرد آزما ہونا جوئے شیر لانے کے

مترادف ہو گا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نو منتخب حکومت کو کن اندرونی اور بیرونی مشکلات کا سامنا ہو گا تاکہ اس امر کا تعین کیا جاسکے کہ کون ان مسائل کا پامردی سے مقابلہ کرنے کی استعداد کار رکھتا ہے۔

پاکستان میں موجودہ دور حکومت مین جس اندرونی مسئلے نے سب سے زیادہ پریشان کیا ہے وہ امن و امان کی بگڑتی صورتحال ہے۔ ملکی عوام دہشت گردی کی شدید یلغار کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے عوام کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکا م اور دہشت گردی کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ اسکی خارجی وجوہات بھی ہیں جن کا تذکرہ آگے ہو گا مگر ناکامی کی اصل وجہ اس معاملے میں سنجیدگی کا فقدان ہے۔ موجودہ حکومت نے عوام کے جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کو اپنا فرض اولین سمجھا ہی نہیں۔ ملک کی پولیس اشرافیہ کی حفاظت پہ مامور رہی۔ خفیہ ایجنسیاں دہشتگردوں کی گردنوں تک پہنچنے میں ناکام رہیں اس سلسلے میں انگریز استبداد کے بنائے پولیس کے نظام کو یکسر بدلنے کی ضرورت ہے جو مظلوم عوام کی گردن پہ لات رکھ کر ظالم حکمران کے اقتدار کو طول دینے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ کراچی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اور حکومت میں شامل اتحادی ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دے چکے ہیں اسی طرح دیگر شہروں میں بھی امن وامان کی صورتحال دگرگوں رہی۔ اس صورتحال سے عوام بے زار ہو چکے ہیں، سرمایہ کاری اور تجارت کو شدید

نقصان ہوا ہے اور مایوسی کا اندھیرا مزید بڑھا ہے۔آئندہ حکومت کے لیے یہ ایک چیلنج ہوگا کہ اس عفریت کا قلع قمع کرکے عوام کا سکھ چھین ان کو لوٹائے پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو از سر نو منظم کرے اور عوامی خدمت کے جذبے سے ان کی تربیت کرے اور ان کے تحفظ کی آئینی ذمہ داری پوری کرے۔

پاکستان کا دوسرا داخلی مسئلہ توانائی کا بحران ہے جسکی وجہ سے قوم اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے، فیکٹریاں کارخانے بند ہیں اور گھروں کے چراغ گل ہیں۔اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ ملک میں توانائی پیدا کرنے کے وسائل موجود نہیں بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے ان وسائل کو استعمال میں لانے کے لیے کوئی حکمت عملی وضع ہی نہیں کی۔نہ ڈیم بنائے نہ دیگر ذرائع کو بروئے کار لایا، رینٹل پاور جیسا مہنگا پراجیکٹ عوام کے کاندھوں پہ ڈال دیا۔اسی طرح قدرتی گیس کے ہوتے ہوئے عوام کے چولہے ٹھنڈے پڑ گئے۔ کارخانوں کی بندش کی وجہ سے لوگ بے روزگار ہوئے اور پریشانی و اضطراب میں اضافہ ہوا۔اسی طرح پاکستان کا ایک اور سلگتا مسئلہ مہنگائی کا ہے۔پاکستان کی اکثریت غریب اور متوسط طبقے پہ مشتمل ہے مگر امیر طبقے سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں نے عوام کا معیار زندگی بلند کرنے پہ سرے سے کوئی توجہ نہیں دی۔ملک میں افراط زر میں اضافہ ہوا اور اسے مصنوعی طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی گئی

جسکے نتیجے میں مہنگائی کا طوفان عظیم برپا ہوا۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں اور ضروریات زندگی عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ موجودہ حکومت کی ناقص پالیسیوں کی وجہ سے عوام مہنگائی کے اس طوفان سے بے حال ہیں۔اب یہ نئی حکومت کا درد سر ہوگا کہ وہ پیداوار میں اضافے اور افراط زر میں کمی کو کس طرح ممکن بناتی ہے۔ان سلگتے مسائل کے علاوہ تعلیم، بے روزگاری، زراعت و دیگر مسائل بھی ہیں جو دھائیوں سے چلے آ رہے ہیں اور ابھی تک حل طلب ہیں۔ نئی منتخب ہونے والی حکومت کو ان مسائل سے عہدہ براء ہونے کے لیے ایک مربوط اور طویل المیعاد منصوبہ بندی کرنا ہو گی تاکہ ملک کو ترقی کی راہ پہ گامزن کیا جاسکے۔

ان داخلی مسائل کے علاوہ پاکستان کو خطے میں بیرونی مسائل کا بھی سامنا ہے ان میں سب سے اہم افغانستان کا مسئلہ ہے۔ مغرب میں افغانستان کے ساتھ ہماری طویل سرحد ہے۔ افغانستان میں ایک طرف داخلی انتشار ہے تو دوسری جانب وہاں امریکی استعمار ہے۔سرحد پہ واقع ہونے کی وجہ سے پاکستان کا ایک کلیدی کردار ہے۔ پاکستان نیٹو کا سٹریٹیجک پارٹنر بھی ہے اور اسکی سپلائی کا ذریعہ بھی۔ اسی وجہ سے پاکستان کو دہشتگردی کے عفریت کا سامنا ہے۔پاکستان میں امریکی ڈرون حملے پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری پہ سوالیہ نشان

ہیں۔امریکہ افغانستان سے انخلاء کی راہیں تلاش کر رہا لیکن مکمل انخلاء کے بجائے اپنی موجودگی برقرار رکھنے کے لیے چند ائیر بیس یہاں رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ چین، روس اور خطے کے دوسرے اہم ممالک پہ نظر رکھ سکے۔ 2014ء میں افغانستان میں انتخابات متوقع ہیں وہاں بھی تبدیلی کا انتظار ہے ہمارے مخالفین یہ نہیں چاہتے کہ پاک افغان تعلقات میں بہتری آئے لہٰذا وہ ابھی سے پاک افغان تعلقات کو بگاڑنے کے لیے اقدامات کر رہے ہیں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال بچھایا جا رہا ہے تاکہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکیں،اس صورتحال میں پاکستان کو اپنے اور خطے کے مفاد میں خارجہ پالیسی ترتیب دینا ہوگی۔ ہماری نئی منتخب حکومت کے لیے یہ ایک چیلنج ہے کہ وہ اس صورتحال میں کیا لائحہ عمل ترتیب دیتی ہے جسکے نتیجے میں خطہ مستقل طور پہ امن کے ثمرات سمیٹ سکے۔

مشرق کی جانب بھارت ہے جو پاکستان کے لیے دردسر ہے۔ پاکستان کے ساتھ بھارت کے تعلقات کبھی بھی دوستانہ نہیں رہے۔ کشمیر کا مسئلہ دونوں ملکوں کے درمیان تنازعہ بنا ہوا ہے۔ اس پہ مستزاد یہ کہ بھارت نے آبی جارحیت بھی شروع کر رکھی ہے اور پاکستان کے دریاؤں کا پانی ہتھیا رہا ہے، بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کو شہ دے رہا ہے اور افغانستان و امریکہ پاکستان سے تعلقات میں سرد مہری پیدا کر رہا ہے۔ اس صورتحال میں پاکستان کی معیشت کی

ریڑھ کی ہڈی یعنی زراعت کہ شدید خطرات لاحق ہیں اور بلوچستان میں امن عامہ کی صورتحال مخدوش ہے۔ بھارت اسوقت ایک عالمی اقصادی قوت کے طور پہ ابھر رہا ہے ۔ پاکستان کو خطے میں امن کے لیے بھارت سے برابری کی سطح پہ دوستانہ تعلقات بھی رکھنا ہیں مگر اپنے دیرینہ مسائل کا حل بھی نکالنا ہے۔

موجودہ جمہوری حکومت نے دو جرات مند اقدامات کیے ہین جنہیں عوامی حلقوں میں سراہا گیا ہے ان میں ایک پاک ایران گیس پائپ لائن کا منصوبہ اور دوسرا گوادر پورٹ کا انتظام چین کے سپرد کرنا۔ ان اقدامات سے امریکہ ناخوش ہے اسکا نتیجہ یہ ہو گا کہ آئندہ پاک امریکہ تعلقات میں تلخی آئے گی اور دوریاں پیدا ہوں گی۔ امریکہ کی طرف سے مالی امداد بند ہو جائیگی جو پاکستان کی معیشت کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہے۔ پاکستان کی نئی حکومت کو ایک طرف امریکہ سے اپنے تعلقات بہتر بنانا ہوں گے دوسری جانب اپنے لیے نئے معاونین بھی تلاش کرنا ہوں گے جن کی امداد سے پاکستان اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو سکے۔ معاشی خود انحصاری کا رویہ اپنانا ہو گا اور کچکول سع قوم کو نجات دلانا ہو گی۔ دوسری جانب ان معاہدوں سے ہمارے بعض اسلامی ممالک بھی ناخوش ہیں ایک جانب وہ ایران کے ساتھ تجارت اور سفارتی تعلقات کی بہتری نہیں چاہتے کیونکہ انکی تیل کی تجارت کو خطرہ ہے تو دوسری جانب گوادر کی کامیابی کو وہ اپنے لیے معاشی خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان دونوں منصوبوں کو ناکام

کرنے کے لیے وہ بلوچستان میں شیعہ سنی کے مابین تصادم کرانا چاہتے ہیں اور بلوچستان میں خانہ جنگی کی ابتدا ہو چکی ہے۔ نئی حکومت کے لیے یہ چیلنج ہے کہ وہ حالات کو خراب ہونے سے بچائے اور خطے میں محبت اتحاد اور یگانگت کی فضاء قائم کرے۔اسلامی ممالک کے درمیان موجود اختلافات کی خلیج کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرے تاکہ مشرق وسطی میں قیام امن یقینی بن سکے۔

سیاسی جماعتوں کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ پاکستان اس وقت بحرانوں میں گھرا ہے اور عوام نجات دہندہ کی تلاش میں ہیں۔جو بھی جماعت اقتدار میں آئے گی اسے ان مسائل کو حل کرنا ہوگا۔اب یہ عذر قابل قبول نہیں ہوگا کہ یہ مسائل تو گزشتہ حکومتوں سے تحفے میں ملے ہیں اسلئے ہم تحائف کو سنبھال کر ہو بہ ہو اسی حالت میں نئی حکومت کے حوالے کر دیں گے۔ پاکستان کے عوام کو بھی چاہیے کہ ان مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے انتخابی عمل می شریک ہوں۔ پارٹیوں کے انتخابی منشور کو ان مسائل کے تناظر میں دیکھیں، پرکھیں اور فیصلہ کریں کہ کس جماعت کے منشور میں ان مسائل کا حل موجود ہے۔ کون سی جماعتیں ان مسائل کے حل کے لیے واقعتاً سنجیدہ ہیں پھر وہ اس کا جائزہ بھی لیں کہ کون سی جماعت میں ان مسائل کے حل کی اہلیت موجود ہے۔اگر عوام نے اپنے لیے صحیح جماعت کا انتخاب کیا اور نئی معرض وجود میں آنے والی حکومت نے ان مسائل کا سنجیدہ حل نکالا تو آئندہ پانچ برس مین پاکستان ایک اقتصادی قوت بن کر ابھرے

گا۔اور دنیا میں پاکستانی قوم کو عزت اور وقار حاصل ہو گا۔

علم کیمیاء کی تاریخ میں ایک دلچسپ دریافت اور بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ

نامور سائنسدان ڈاکٹر عبدالمجید خان جنجوعہ کا اعزاز

علم کیمیاء کی تاریخ میں ایک دلچسپ دریافت اور بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ

از

راجہ محمد عتیق افسر

ریسرچ لیبارٹری آف بائیو انرجی، شعبہ کیمیاء ، وفاقی اردو یونیورسٹی کے نامور سائنسدان ڈاکٹر عبدالمجید خان نے میرین الجی (Algae) سے ایک ایسے ناول (جدید الخلقت /غیر معمولی) مرکب کی دریافت کی ہے جس کی بنیادی ساخت علم کیمیاء کی تاریخ میں پہلی مرتبہ معرض وجود میں آئی ہے۔قدرتی طور پر بننے والے اس خوبصورت اور ناول مرکب کا تعلق الکالائیڈ کی کلاس سے ہے جس کا نام Jolynamine ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب اپنی مسلسل تحقیقی کاوشوں کی بدولت میرین الجی سے دوسرے کئی نئے مرکبات دریافت کر چکے ہیں جنہیں دنیا کے لاتعداد سائنسدان بطور حوالہ استعمال کرکے مستفید ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ دریافت بلا شبہ پاکستان میں ہونے والی اہم اور معیاری تحقیق کا مظہر

ہے۔

علاوہ ازیں آپ توانائی کے بحران، گلوبل وارمنگ، ماحولیاتی آلودگی اور بائیو ڈائیورسٹی جیسے بیشمار چیلنجز کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرین الجی اور بائیو ویسٹ سے بائیو فیولز کی تیاری پر گراں قدر تحقیقی مقالہ جات شائع کر چکے ہیں جن سے پوری دنیا کو درپیش خطرات کے حل میں مدد مل رہی ہے۔اس نوع کی معیاری تحقیق وفاقی اردو یونیورسٹی کو بین الاقوامی سطح پر بلند مقام دلانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ریسرچ کے میدان میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات نہ صرف وفاقی اردو یونیورسٹی بلکہ تمام اہل پاکستان کے لئے باعث فخر ہیں۔

آپ کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں حال ہی میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن، اسلام آباد میں آپ کو بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ وزیر تعلیم میاں محمد بلیغ الرحمٰن نے عطا کیا۔یاد رہے کہ پاکستان بشمول آزاد کشمیر میں یونیورسٹی کی سطح پر 70000 سے زائد اساتذہ تدریس و تحقیق میں مصروف ہیں۔ایچ ای سی نے ان 70000 اساتذہ میں سے میرٹ کی بنیاد پر صرف 63 اساتذہ کو بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ عطا کیا جن میں ڈاکٹر عبدالمجید خان کا نام سرفہرست ہے۔آپ کی پیشہ وارانہ کارکردگی اور خدمات کے صلے میں ملنے والا یہ ایوارڈ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جن سائنسی خدمات کی بنیاد پر آپ کو بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر

ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں خاص طور پر قومی و بین الاقوامی جرائد میں مقالہ جات کی اشاعت، قومی و بین الاقوامی کانفرنسسز کا انعقاد و شرکت، قومی و بین الاقوامی سائنٹیفک باڈیز کی ممبر شپ، پاکستان میں متبادل توانائی اور ادویات کی فیلڈ میں نئی و معیاری تحقیق، شعبہ کیمیاء و فیکلٹی آف فارمیسی میں تجربہ گاہوں کی تعمیر و ترقی، معیاری تدریسی طریقہ کار اور دنیا میں تحقیق کے فروغ کے لئے کئے گئے نئے اقدامات شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمجید خان کا تعلق کفل گڑھ ضلع باغ آزاد کشمیر سے ہے اور آپ جنجوعہ قبیلے کے سرمایۂ افتخار فرزند ہیں۔آپ دنیا کے مایہ ناز سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر عطا الرحمٰن کے پچاسویں پی ایچ ڈی طالب علم رہے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ آپ نے پاکستان کے دوسرے بڑے سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال چوھدری کی زیر نگرانی پوسٹ ڈاکٹریٹ کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔اس وقت متعدد ایم فل /ایم ایس /پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالرز آپ کی زیر نگرانی محو تحقیق ہیں۔

نائیک سیف علی خان جنجوعہ

نشان حیدر کا حامل گمنام سپاہی

نائیک سیف علی خان جنجوعہ کھنڈ باز (کھنڈہار) تحصیل نکیال (کوٹلی آزاد جموں و کشمیر) میں 25 اپریل 1922 میں پیدا ہوئے. وہ 18 مارچ 1941 کو برٹش انڈین آرمی میں انجینئرز کی رائل کور میں بھرتی ہوئے. 1947 میں برٹش انڈین آرمی میں اپنی سروس مکمل کرنے کے بعد اپنے آبائی شہر واپس آئے اور سردار فتح محمد کریلوی کے تعاون سے حیدری فورس قائم کرنے کا آغاز کیا. یکم جنوری 1948 ، حیدری فورس کو بعد ازاں لیفٹیننٹ کرنل محمد شیر خان کے حکم کے تحت " شیر ریاستی بٹالین " میں بدل دیا گیا. بعد میں ریاست کے دیگر علاقوں کی تنظیمات کو یکجا کرکے آزاد کشمیر ریگولر فورس اور پھر آزاد کشمیر رجمنٹ میں بدل دیا گیا۔

آپ کی جرات، لگن اور مقصد سے دلی وابستگی کے اعتراف پر آپ کو نائیک کے عہدے پہ تعینات کرکے پلاٹون کمانڈر بنایا گیا. آپ نے پیشہ وارانہ مہارت اور باہمی مشاورت کی اعلی مثالیں قائم کیں اور دشمن کو بھاری نقصان پہنچایا۔

آپ کی پلاٹون کو بڈھاکھنا کا دفاع کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی جہاں آپ کو دشمن کی مشین گن کی مسلسل فائرنگ کا دوبدو سامنا کرنا پڑا. آپ نے اپنے چند جوانوں کے ساتھ مل کر اپنی قائم کردہ پوسٹ کا بے جگری اور پا مردی سے دفاع کیا اور دشمن کے جارحانہ منصوبوں کو ناکام بنایا اور انہیں ناکوں چنے چبوائے. دشمن نے پوسٹ پر قبضہ کرنے کے لیئے اپنی دو کمپنیوں کے ساتھ بھرپور حملے اور بھاری گولہ باری کی لیکن آپ کے جذبہ شہادت اور عزم مصمم نے دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا. بہادری اور جرات کی ذاتی مثال قائم کرتے ہوئے تمام مشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے جوانوں کی قیادت کی اور پوسٹ پر ثابت قدم اور چٹان کی طرح قائم رہے. کارروائی کے دوران دشمن کی طرف سے توپ کا گولہ آپ کے سینے پہ لگا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی پوسٹ، پہ سیسہ پلائی دیوار کی طرح قائم رہے اور بھارتی حملہ آوروں کے ہاتھ مایوسی کے سوا کچھ نہ آیا. شدید چوٹوں کی وجہ سے آپ نے 26 اکتوبر 1948 کو شہادت کا وہ جام پی ہی لیا جس کے آپ تمنائی تھے .

مارچ 1949 ، کو آزاد جموں و کشمیر کی دفاعی کونسل نے آپ کی جرات اور بے 14 مثال فرض شناسی کے اعتراف میں آزاد کشمیر کے سب سے بڑے فوجی اعزاز ہلال کشمیر بعد از شہادت) سے نوازا۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے اپنے گزٹ نوٹیفکیشن) میں ہلال کشمیر کو نشان حیدر کے مساوی کرنے کا اعلان کیا 1995 ء .

وں میں واقع ہے۔آپ کا مزار آپ کے آبائی گا
میڈیا پہ آپ کا تذکرہ کم ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ آپ کے نام ، کارناموں اور اعزاز سے واقف ہے ۔تاہم انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے آپ کو پردہ اخفا سے باہر لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔حکومت پاکستان نے آپ کی لازوال قربانی کی یاد میں اپریل 2013 کو ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا ہے جو محکمہ ڈاک سے دستیاب 30 ہے۔آپ کے علاقے سے تعلق رکھنے والے بعض اہل دانش افراد آپ کے نام سے رفاہی اور علمی ادارے بھی چلا رہے ہیں۔آپ بلا شرکت غیرے آزاد کشمیر کے سب سے بڑے فوجی اعزاز ہلال کشمیر کے حامل ہیں۔ ہلال کشمیر چونکہ نشان حیدر کے مساوی ہے لہٰذا کل گیارہ افراد نشان حیدر کے وصول کنندہ ہیں. نائیک سیف علی جنجوعہ آزاد کشمیر کے واحد نشان حیدر وصول کنندہ ہیں.

قاضی حسین احمدؒ ایک رجحان ساز قائد

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی شخصیات ایسی گزری ہیں جنہوں نے ایک اعلیٰ و مقدس نصب العین کے ساتھ وابستگی میں اپنی عمریں لٹا دیں اور جاتے ہوئے ایسے ان مٹ نقوش ثبت کر گئیں جو ایک عرصے تک یاد رکھے جائیں گے۔ان شخصیات میں اقبال کے شاہیں کی عملی تصویر پیش کرنے والے نرم دم گفتگو و گرم دم جستجو قاضی حسین احمدؒ بھی ہیں جو عمر عزیز کا بیشتر وقت اقامت دین کی تحریک کو ودیعت کرنے کے بعد ۵ اور ۶ جنوری ۲۰۱۳ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔دلوں پہ راج کرنے والے ہر دل عزیز قاضی صاحب اپنے حلقہ یاراں کو تو سوگوار چھوڑ گئے مگر جاتے جاتے وہ نقوش پا بھی چھوڑ گئے ہیں جو نہ صرف تحریک اسلامی بلکہ ملت اسلامی کے لیے کامیابی کا زینہ ثابت ہوں گے۔

شب ظلمت میں اجالے کی خبر دیتے ہیں
یہ ہیں وہ لوگ جو پیغام سحر دیتے ہیں۔

قاضی صاحب ایک ہمہ پہلو (Multi Dimentional) شخصیت کے مالک تھے۔فراست مؤمن کی جیتی جاگتی تصویر، نگہ بلند و سخن دلنواز و جان پر سوز جیسی قائدانہ صلاحیتوں کے آئینہ دار درویش صفت، آزاد منش، صاحب بصیرت، دور اندیش اور

مستیٔ کردار سے بھرپور طبیعت کے انسان تھے۔ وہ راست بازی حق گوئی، ایثار اور حسن اخلاق، خلوص، انکسار اور تواضع کا پیکر تھے۔ آپ تقریر اور تحریر دونوں میں اللہ کی برہان دکھتے تھے۔ دین کی سربلندی کے لیے لڑنے والے سرفروش سپاہی بھی ہیں، مجاہدین کے پشتیبان بھی اور خوئے دلنوازی کے حامل قائد تحریک بھی۔ ایک طرف ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارتے ہیں تو دوسری جانب مظلوم کے لیے آنکھیں بچھا کر درد آشنائی کرتے ہیں۔ آپ کبھی جمال الدین افغانی کا کردار ادا کرتے ہیں اور کبھی سلطان ٹیپو کی تلوار بن جاتے ہیں۔ غرض انکی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا کسی ایک لکھاری کے بس میں نہیں۔ ان کی شخصیت کا جو پہلو انہیں دیگر قائدین سے ممتاز کرتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف جماعت (Trend Setter) ہے وہ انکی رجحان ساز اسلامی بلکہ قوم کو نئے رجحانات سے متعارف کرایا۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو سے نہ صرف جماعت اسلامی نے استفادہ کیا بلکہ عالم اسلام کی دیگر جماعتوں نے بھی انکے طرز عمل کو مشعل راہ بنایا۔

قاضی صاحب اسم با مسمّٰی واقع ہوئے ہیں ان کے نام کے تینوں اجزاء قاضی، حسین اور احمد ان کی شخصیت کے سے جھلکتے ہیں۔ آپ امت مسلمہ کی وحدت کے داعی تھے اور آپ نے اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرنے کے لیے دیواروں کو گرا کر پل باندھنے کے کٹھن فیصلے کیے۔ آپ نے مختلف مسالک کے علماء کو جن کے مابین

اختلافات کی خلیجیں حائل تھیں ایک دوسرے کے قریب لایا۔اس سلسلے مین آپ نے پہلے ملی یکجہتی کونسل اور بعد ازاں متحدہ مجلس عمل کی داغ بیل ڈالی۔آپ نے شدید اختلافات کے باوجود اشتراک عمل کو ممکن بنایا امت مسلمہ کے بکھرے دھڑوں کو ملا کر سیدنا حسینؓ کی سنت کو زندہ کیا اور نبی مجتبیٰ احمد مصطفیٰ ﷺ کی امت کو جسد واحد کی طرح مجتمع کرنے کا حق ادا کیا۔ موجودہ دور میں یہ پاکستان بلکہ عالم اسلام میں میں ایک نئے رجحان کے طور پہ سامنے آیا کہ ایک عظیم مقصد کی خاطر اپنے اختلافات کو بھلایا جائے اور باہم دست و گریبان ہونے کے بجائے ایک دوسرے کا دست و بازو بن کے آگے بڑھا جائے۔ قاضی صاحب نے جو شجرکاری کی مذہبی قیادت اس کے پھل کی شیرینی و حلاوت سے اب آگاہ ہو چکی ہے۔وہ نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالم اسلام میں محبت و یگانگت کی فضا کے اس رجحاں کے خالق ہیں۔پاکستان میں موجود مذہبی قیادت نے ان سے استفادہ بعد میں کیا جبکہ دیگر ممالک میں موجود اسلامی تحریک نے ان کے اندر چھپی اس صلاحیت کا لوہا پہلے ہی مان لیا تھا۔ انہوں نے دیگر ممالک میں موجود اسلامی تحریکوں کو قریب لانے اور امداد باہمی کی فضا قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دیگر ممالک میں کام کرنے والی اسلامی تحریکوں کے درمیان اختلافات کے تصفیے کرائے۔سوڈان میں صدر عمر البشیر اور ڈاکٹر حسن ترابی کے درمیان تصفیہ کرایا اسی طرح افغانستان میں برسوں سے متحارب انجنیئر گلبدین حکمتیار اور پروفیسر برہان الدین ربانی کے مابین جنگ بندی کرائی۔ قاضی صاحب کی ان

کاوشوں کے نتیجے میں جماعت اسلامی کو امت مسلمہ کی مؤثر جماعت خیال کیا جانے لگا۔ بطور امیر قاضی صاحب نے جماعت اسلامی کو عوامی رنگ عطا کیا۔ پاکستان اسلامک فرنٹ ان کی رجحان ساز سوچ کا ایک کارنامہ ہے۔ اگرچہ اس امر پہ ان سے جماعت اسلامی کے ایک وسیع حلقے نے اختلاف بھی کیا مگر اس سے قطع نظر اس نئے رجحان کی بدولت جماعت اسلامی مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد میں مقبول ہوئی اور لوگوں کا ایک ہجوم جماعت اسلامی کی دعوت سے متاثر ہو کر حلقہ اثر میں شامل ہوا۔ اس تجربے کا مقصد یہ تھا کہ عوام میں اسلامی تحریک کا ایک سیاسی شعبہ متعارف کرایا جائے جو مستقل طور پر سیاسی امور کو نمٹائے۔ اس طرح جماعت اسلامی کو پھلنے پھولنے کے لیے زیادہ مواقع میسر آئیں گے۔ جماعت اسلامی دعوت و تربیت کا کام کرے گی اور اسی کے ذمہ دار افراد کی سرکردگی میں سیاسی شعبہ (Political Wing) یعنیا سلامک فرنٹ کی سیاسی میدان میں خدمات انجام دے گا۔ اس تقسیم کار سے افراد پہ ذمہ داریوں کا بوجھ بٹ جائے گا اور استعداد کار میں اضافہ ہو گا۔ یہ تجربہ بعض وجوہات کی بنا پر پاکستان میں تو کامیاب نہ ہوا مگر عالم اسلام کی دیگر اسلامی تحریکوں میں اسے پزیرائی ملی اور اب تیونس، لیبیا، مراکش، مصر، ہندوستان، ملائشیا اور دیگر ممالک میں اپنا بھی لیا گیا ہے اور اس کے ثمرات بھی سمیٹے جا رہے ہیں۔ اس

نئے رجحان کی بدولت جماعت اسلامی ایک دینی تحریک کے ساتھ ساتھ قومی دھارے کی سیاسی جماعتوں میں بھی شمار ہونے لگی۔ گویا جماعت اسلامی جو قطرہ قطرہ جمع ہونے والے خالص پانی کی ایک جھیل بن چکی تھی قاضی صاحب نے اسے دریا کی روانی عطا کر دی۔ آپ کی زیر قیادت جماعت اسلامی نے دھرنوں، ملین مارچ، انسانی ہاتھوں کی زنجیر اور دیگر نئے طریقوں سے اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کیا۔ اب دیگر جماعتیں بھی انہی طریقوں کو اپنا رہی ہیں۔

جماعت اسلامی جیسی تنظیمیں معاشرے کے صالح اور شریف افراد پہ مشتمل ہوتی ہیں اور شرفاء کا وطیرہ ہے کہ وہ جنگ وجدل سے اعراض کرتے ہیں۔ اس شرافت کو معاشرے کے عاقبت نا اندیش لوگ بزدلی اور کمزوری گردانتے ہیں اور بزور طاقت عوام کو حق کے راستے سے ہٹانے کی سعی کرتے ہیں اسکے نتیجے میں عوام کی اکثریت مرعوب ہو کر ظالموں کا ساتھ دینے پہ مجبور ہوتی ہے۔ معاشرے کے اس رجحان کو بدلنے کے لیے قاضی صاحب نے اولاً پاسبان اور بعد ازاں شباب ملی کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کی معاشرے کے صالح اور تربیت یافتہ نوجوانوں کو دہشت پھیلانے والے افراد کے مقابل لا کھڑا کیا جائے۔ قانون و شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے دست بزید کو روکا جائے۔ اس رجحان کی وجہ سے ملک کے مزدوروں، کاشتکاروں اور کمزور طبقات کو معاشرے کے بااثر افراد کے قہر سے نجات ملی اور وہ جبر ناروا سے مفاہمت کے بجائے سربکف ہو کر اس کے مقابلے کے

لیے تیار ہونا شروع ہوئے۔ ظلم کے پروردہ لوگوں کو اپنے مزموم ارادوں کی تکمیل کچھ رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ جماعت اسلامی کو انہوں نے آب رواں بنایا تھا تو موج دریا بھی انہوں نے خود ہی عطا کر دی۔

ملک کے قبائلی علاقوں کو قومی و سیاسی دھارے میں لانے کے لیے آواز قاضی صاحب نے ہی بلند کی۔ انہوں نے ان علاقوں میں جماعت اسلامی کی تنظیم سازی کی اور سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ وہ متعدد بار سیاسی پروگراموں میں شرکت کے لیے قبائلی علاقوں میں گئے اور اس پاداش میں انہیں نظربندی اور گرفتاری کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آپ نے قبائلی عوام پر ڈرون حملوں کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی۔ آج ہر سیاسی جماعت اس مؤقف کو اپنا رہی ہے اور قبائلی علاقوں کو سیاسی حقوق دلانے کی بات کرتی ہے۔ اسی طرح بلوچستان کے سلگتے مسئلے کے حل کے لیے آپ نے صوبے کی سیاسی قیادت سے روابط استوار کیے۔ قوم پرست جماعتیں جماعت اسلامی کو طفیلی جماعت سمجھتی تھیں اور پنجاب سے عناد کا رویہ رکھتی تھیں قاضی صاحب کے طرز سیاست کی بدولت وہ جماعت اسلامی کے قریب آئیں اور اب وہ قومی جماعتوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کر رہی ہیں۔ قاضی صاحب نے علاقائیت اور صوبائیت کی طرف بڑھتے عفریت کو ملک وملت کے مفادات کے لیے سوچنے کے رجحان میں بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔

قاضی صاحب نے اندرون ملک ہی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی بلکہ جہاں جہاں خون مسلم کی ارزانی دیکھی وہاں جہاد کا علم بلند کرنے والے مسلمانوں کی سیاسی، مالی و سفارتی پشتیبانی کی۔ جماعت اسلامی اول روز سے ہی" ۔ ایکسینٹ ءبیٔب تجیب ۸ پاسبانی کے لیے "کا نعرہ لے کر اٹھی تھی قاضی صاحب نے نیل کے ساحل سے تابخاک کاشغر اس نعرے کو سچ ثابت کر دکھایا۔ آپ نے جہاد افغانستان، جہاد کشمیر کے موقع پر مجاہدین کی پشتیبانی بھی کی اور مجاہدین کے مؤقف کو گلی گلی کوچہ کوچہ عام کیا جس کے نتیجے میں پوری قوم مجاہدین کی پشت پہ کھڑی ہو گئی۔ پاکستان کے طول و عرض میں ایک مجاہد کلچر پروان چڑھا۔ جہاد کی اصطلاح اتنی عام ہوئی کہ اسے آکسفورڈ ڈکشنری میں بھی شامل کر لیا گیا۔ اسکے علاوہ بوسنیا، کوسوو، فلسطین اور عراق کے مظلوم مسلمانوں کا دکھڑا تمام دنیا کے سامنے لایا اور صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ دیگر اسلامی ممالک کے کانوں میں آذان حق دی۔ ان کوششوں کی بدولت پاکستانی عوام کے دل دنیا کے دیگر مسلمانوں کے لیے دھڑکنے لگے بلکہ عوام کی اکثریت کے اس رجحان کے پیش نظر بوسنیا اور کوسوو کے مسئلے میں تو حکومت پاکستان نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔

قاضی صاحب ذاتی طور پہ ایک درد آشنا شخصیت تھے اور اس درد آشنائی نے جماعت اسلامی کو ایک اور رجحان سے متعارف کرایا۔ جماعت اسلامی میں شعبہ خدمت خلق

کے نام سے ایک شعبہ موجود تھا جو خدمت خلق کے جذبے سے فلاح انسانیت کا کام کرتا تھا قاضی صاحب نے اسے الخدمت فاونڈیشن کے نام سے توسیع دے کر ملک گیر سطح پر منظم کیا۔اللہ کے فضل سے الخدمت فاؤنڈیشن اس وقت قومی اور بین الاقوامی سطح کی نجی تنظیموں (این جی اوز) کی طرز پہ کام کر رہی ہے۔ 2005 کے زلزلے، سوات آپریشن اور 2010 کے بدترین سیلاب میں جب حکومت نے متاثرین کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا تھا اس وقت الخدمت فاونڈیشن نے ان کے زخموں پہ مرہم رکھااو امداد و بحالی کی بے مثال خدمات انجام دے کر ایک تاریخ رقم کی جن کا اعتراف سیکولر طبقات اور اسوقت کے حکمرانوں نے بھی کیا۔الخدمت فاونڈیشن کراچی سے خیبر اور کوئٹہ سے کشمیر تک اپنے وسیع نیٹ ورک کے ذریعے عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ہمہ تن مصروف عمل ہے۔ جماعت اسلامی اس وقت ملک میں کے قریب ہسپتال چلا رہی ہے ان میں بعض تدریسی (ٹیچنگ) ہسپتال بھی شامل 45 ہیں ۔ اسکے علاوہ مراکز صحت اور ایمبولینس سروس کا ایک جال ہے جو کسی بھی ناگہانی آفت سے نمٹنے کے لیے ہر دم تیار ہے اور عام حالات میں بھی مریضوں کو سہولت فراہم کرتا ہے۔

قاضی صاحب ایک علمی گھرانے کے چشم وچراغ تھے لہٰذا علم سے وابستگی ان کی شخصیت کا خاصا تھا۔ انہوں نے حرا سکول سسٹم کے تحت ایسے سکولوں کی بنیاد رکھی جو تعلیم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کی ذمہ داری

بھی اٹھائیں ۔ قاضی صاحب کی خواہش تھی کہ ملا اور مسٹر کی تفریق کو ختم کیا جائے۔ اس سوچ کو معاشرے میں پذیرائی ملی۔ جماعت اسلامی کی تقلید میں دیگر مذہبی جماعتوں اور اداروں نے بھی ایسے ادارے قائم کیے۔ یہاں تک کہ دینی مدارس نے بھی اپنے خود کو عصری تعلیم سے ہم آہنگ کرنا شروع کر دیا۔ اب ہر شہر میں ایسے اداروں کی بہتات دیکھنے کو ملتی ہے ۔اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت مین تو اس رجحان کو حکومتی سطح پہ بھی اپنایا اور مسجد مکتب سکول شروع ہوئے ان سکولوں کی وجہ سے پرائمری تک کی تعلیم کافی حد تک عام ہوئی۔ قاضی صاحب کی سوچ تعلیم کو عام کرنے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ انہوں نے ایسے ادارے قائم کیے اور ان کی سرپرستی کی جو سماجی، معاشرتی ، سیاسی اور اقتصادی مسائل پہ تحقیق کرکے مستقبل کی حکمت عملی وضع کرتے ہیں ۔ان اداروں کی جاری تحقیق کے نتیجے میں تحریک اسلامی اس وقت دور جدید کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی حکمت عملی سے مکمل طور پہ لیس ہے۔اسکے علاوہ جماعت اسلامی کا لٹریچر مختلف زبانون میں ترجمہ کرکے متعلقہ علاقوں میں فراہم کیا جاتا ہے جس سے تحریک اسلامی کو عالمگیر وسعت ملی ہے۔

قاضی صاحب کے نئے رجحانات کی بدولت جماعت اسلامی ملک کی وہ واحد جماعت بن گئی ہے جس کے پاس ہر شعبہ زندگی کو سنوارنے کے لیے اپنی حکمت عملی موجود ہے مثلا جماعت اسلامی کے پاس خارجہ و داخلہ پالیسی ہے اور وہ عملی طور پر اسکا

مظاہرہ بھی کر رہی ہے۔اسکے پاس اقتصادی پالیسی ہے جسے وہ اپنی تنظیم اور اداروں پہ لاگو بھی کر رہی ہے،اسکے پاس سماجی خدمت کا ایک مربوط جال ہے اور علم و ادب میں اسکی حیثیت مسلم ہے۔غرض جماعت اسلامی اس قابل ہو چکی ہے کہ قوم کی قیادت اور مسیحائی کر سکے۔وہ اس وقت ہمیں داغ مفارقت دے گئے جب ان کی لگائی کھیتی پک کر تیار ہونے کو تھی۔

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شام غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا

قاضی صاحب کی رحلت ایک قومی المیہ ہے۔ان کے چلے جانے سے جماعت اسلامی ہی نہیں بلکہ امت مسلمہ ایک ملنسار، جری، نڈر اور دور اندیش قائد سے محروم ہو گئی ہے۔افراد کو دنیا میں ایک خاص مدت تک رہنا اور پھر داعی اجل کو لبیک کہ دینا ہوتا ہے۔مگر قائد تو وہ ہوتا ہے جو ایسے چراغ روشن کر جائے کہ رہتی دنیا تک قافلے ان کی روشنی میں اپنی منزل کا تعین کرتے رہیں۔انہوں نے زندگی میں جو رجحانات اپنی جماعت اور امت مسلمہ کو عطا کیے ہیں امید ہے کہ آئندہ قیادتیں ان سے رہنمائی لیتے ہوئے وہ اقدامات کریں گی جن سے ان کی جدائی کا خلا پورا ہو سکے اور بدلتے وقت اور حالات کا ادراک کرتے ہوئے کچھ مزید رجحانات متعارف کرائیں گی جو امت مسلمہ کو دوبارہ عظمت کے بلند آسمانوں پہ لے جائیں۔

امن کا خواب اور پولیس کا فرسودہ نظام

وطن عزیز پاکستان میں کچھ عرصہ قبل تبدیلی کی ایک لہر آئی تھی اور ہر کوئی تبدیلی ہی کے گن گا رہا تھا اور سیاسی جماعتیں تبدیلی کے راگ الاپ رہی تھیں۔ الیکشن برپا ہوئے نئی حکومتیں وجود میں آئیں نئے وزراء آئے اور پھر عوام کا جوش کم ہوتا گیا اور تبدیلی کی باتیں بھول بھلیوں میں گم ہو گئیں۔ وطن عزیز کے کوچہ بازار دہشت گردی کا تاحال شکار ہیں، بیرونی دشمنان دوستی کا جھانسا دے کر آئے دن وطن عزیز کی سرحدوں کو پامال کر رہے ہیں امن و امان عنقا ہے دلوں میں خوف و ہراس بدستور باقی ہے۔ نئی حکومتیں اس تمام صورتحال کا ذمہ دار گزشتہ حکومت کو قرار دے کر اپنا دامن چھڑا دیتی ہیں اور عوام پھر ناامیدی کی چادر اوڑھ کر خواب غفلت کے مزے لے رہے ہیں۔ یہ بات حقیقت ہے کہ اس وقت امن و امان ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جسکی وجہ سے کاروباری سرگرمیاں جمود کا شکار ہو رہی ہیں اور معیشت شدید تباہی کی طرف گامزن ہے۔ کاش کہ عوام سے ووٹ لے کر ایوان اقتدار میں آنے والے امن و امان کو مسئلہ گردانتے ہوئے اسکا جامع حل تلاش کرتے تو آج تک اسکے ثمرات نظر آنے لگتے۔

خوف و دہشت کی فضا کو ختم کرنے کی ذمہ داری جس محکمے پہ سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے وہ ہے پولیس ۔ مگر بد قسمتی سے ہمارا پولیس کا نظام ہمیں انگریز سے ورثے میں ملا ہے اور انہوں نے یہ نظام مفاد عامہ میں نہیں بلکہ سامراج کو عوام پہ مسلط کرنے کی غرض سے وضع کیا تھا۔اسکا واحد مقصد یہ تھا کہ جو لکیریں انگریز آقا کھینچتے چلے جائیں قوم کو انکی فقیری پہ مجور کیا جائے۔ انگریز تو یہ ملک چھوڑ کے چلے گئے مگر ہمارا مقتدر طبقہ استبداد کے حربے کے طور پہ اسے استعمال کر رہا ہے۔ ہماری سیاسی حکومتوں کو بھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس محکمہ کو حکام کی چاکری کے بجائے عوام کی خدمت اور تحفظ پہ مامور کیا جائے۔یہی وجہ ہے کہ پولیس کا موجودہ نظام مجرموں کے تحفظ اور عوام کے خوف کا باعث بنا ہوا ہے۔ عوام دہشت گردی سے اتنا ہراساں نہیں ہیں جتنا کہ پولیس کی ناقص کارکردگی سے نالاں ہیں۔

ہمارے نظام پولیس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اسکے افسران و سپاہیوں کی یہ سوچ ہے کہ پولیس کا تعلق جرم و سزا سے ہے اور محکمے کا کام مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے حالانکہ اس محکمے کا فرض امن کا قیام ہے۔بظاہر تو یہ الفاظ کا ہیر پھیر نظر آتا ہے مگر فی الحقیقت ان دونوں سوچوں کو اثرات اور ثمرات ایک دوسرے سے قطعی طور پہ مختلف ہیں ۔ پہلی سوچ محکمے کو آقا اور عوام کو غلام بنا دیتی ہے جبکہ دوسری سوچ محکمے کو اپنی عوام کا خادم

و محافظ بنا دیتی ہے۔ پہلی سوچ کے حامل اہلکار عوام کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری سوچ کے اہلکار عوام کے جان و مال کے تحفظ کا سوچتے ہیں۔ پولیس اہلکاروں کا اپنے محکمے کے بارے میں عقیدہ بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے عوام کی توقعات پہ پورا اتر سکیں۔

اس سوچ کا مشاہدہ ہم اس بات سے کر سکتے ہیں کہ وہ اہلکار محکمے کی آنکھ کا تارہ اور ماتھے کا جھومر سمجھے جاتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ مجرموں کو پابند سلاسل کریں، زیادہ سے زیادہ چھاپے ماریں۔ ایسے اہلکاروں کو محکمے اور حکومت دونوں کی جانب سے تھپکیاں اور اعزازات عطا کیے جاتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب تو اسی وقت ہو گا جب جرائم ہوں گے۔ اور اگر گہرائی سے نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات جرائم کی پشت پناہی پولیس اہلکار اپنے منپسند افراد کے ذریعے کراتے ہیں یہی مجرم عناصر پہلیس کے مخبر ہوتے ہیں اور انہی کے ذریے چھاپے مارے جاتے ہیں اور نیے لوگ شکار کیے جاتے ہیں۔ اس کلچر کو ختم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے اس کی جگہ ان اہلکاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اپنے علاقے سے جرائم کی روک تھام میں کامیاب ہوئے ہوں۔ ان تھانوں کو مثالی قرار دیا جائے جہاں جرائم کا تناسب سب سے کم ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حکومت خود بھی پولیس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ عوام کا خون چھوسے ۔ تھانوں اور چوکیوں کو روزانہ کی بنیاد پہ ایندھن اور دیگر ضروریات کے لیے جتنی رقم فراہم کی جاتی ہے اس میں یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ تھانے کی حدود میں گشت کرکے عوام کی خبر گیری کی جائے اور اگر کوئی ستم رسیدہ فریادی زنجیر عدل ہلانے کی جسارت کرتے ہوئے تھانے تک آ جائے تو آمد و رفت کے اخراجات اسی کی جیب سے وصول کیے جاتے ہیں ۔ پھر مدعی اور مدعا علیہ دونوں سے رقم بٹوری جاتی ہے اور بالآخر جیت اسی کی ہوتی ہے جو زیادہ خرچ کرے۔ یہیں سے رشوت کا کلچر جنم لیتا ہے اور قانوں کی وردیوں میں ملبوس اہلکار ہی قانون کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں ۔ حکومت کو چاہیے کہ اہلکاروں کو جدید سہولیات اور وسائل فراہم کیے جائیں تاکہ خدمت کا معاوضہ عوام سے نہ وصول کیا جائے ۔ اور اسی پہ اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ایسا نظام وضع کیا جائے جسکی بدولت کالی بھیڑیں منظر عام پہ آئیں اسکے لیے عوامی سطح پہ ایسے ادارے یا کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو محکمے کی کارکردگی کا جائزہ لیں اور رپورٹ حکومت تک پہنچائیں۔

ان سب اسباب کے علاوہ اقربا پروری اور خلاف استحقاق بھرتیوں کے باعث ایسے افراد پولیس فورس میں شامل ہوتے ہیں جو ذہنی و جسمانی طور پر فرائض منصبی کو انجام دینے کے اہل نہیں ہوتے وہ صرف مراعات کی غرض سے پولیس کا حصہ بن

جاتے ہیں اور تمام عمر قومی خزانے پہ بوجھ بنے رہتے ہیں۔ اس پہ مستزاد یہ کہ محکمے کی طرف سے دی جانے والی تربیت بھی ناکافی ہوتی ہے یہ سب باتیں محکمے کہ استعداد کار کہ صفر کر دیتی ہیں۔ سب سے اہم کام یہ ہے کہ عوام کے اندر قانوں کا احترام پیدا کیا جائے اور یہ باور کرایا جائے کہ قانوں ان کی فلاح کے لیے بنایا گیا ہے اور ان کی فلاح اس پہ عمل کرنے میں ہی پوشیدہ ہے۔ اقربا پروری کا کلچر ختم کیا جائے میرٹ پہ بھرتیاں کی جائیں اور عالمی معیار کے مطابق تربیت فراہم کی جائے تاکہ پولیس کی کارکردگی عوام کو نظر آئے۔ پولیس کو عوام کے قریب لانے کی کوشش کی جائے تاکہ محکمے کے بارے میں موجود عدم اعتماد کی فضا کا خاتمہ کیا جاسکے اور ملک کا پہیہ درست سمت میں چل سکے۔ ہماری آرزہ ہے کہ ملک کی جیلیں ویران ہو جائیں اور حکومت کو یہ جیلیں دیگر ممالک کہ کرائے پہ دینا پڑیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ملک کے مقتدر طبقے کو عوامی فلاح و بہبود کی سوچ اور بصیرت عطا فرمائے اور پاکستان کو ترقی و امن کا گہوارہ بنائے۔۔۔آمین

یکجہتی کشمیر اور ہماری ذمہ داریاں

"کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے" بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے اس تاریخی جملے کی بازگشت ہر وقت سنائی دیتی ہے اور اس وقت تو مزید بڑھ جاتی ہے جب کشمیر کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہو۔ بانی پاکستان کے نزدیک کشمیر کی پاکستان کے لیے اہمیت مسلم تھی اسی لیے وہ قوم کو اس راز سے آگاہ کر گئے۔ پاکستان کے نام سے لے کر اسکے جغرافیہ، سیاست، دفاع، معاشرت اور معیشت غرضکسی بھی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل ہے۔یا پھر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر پاکستان کا جزو لاینفعک ہے۔ کشمیر کا جغرافیہ اور عین قلب ایشیا میں وقوع پزیر ہونا اس کی اہمیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ کشمیر وہ خطہ ارض ہے جس کی سرحدیں دنیا کی چار جوہری طاقتوں کے ساتھ ملتی ہیں۔ کشمیر کے برگ و گل سے ٹپکنے والا قطرہ شبنم بھی جب جوئے آب اور دریائے تند و تیز کا روپ دھارتا ہے تو پاکستان کی زرعی زمینیوں کو لہلہاتی فصلیں اگانے کے قابل بناتا ہے یعنی پاکستان کی زرخیز زمینوں کو سیراب کرنے والے سدابہار دریاؤں کا منبع کشمیر ہی ہے۔ گویا کشمیر کی آبادی ہی نہیں بلکہ کوہ و دمن اور حیوانات و جمادات بھی پاکستان کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں۔اگر مادہ پرست دور میں مادیت کی آنکھ سے بھی جائزہ لیا

جائے تو کشمیر کا تعلق پاکستان سے ہی بنتا دکھائی دیتا ہے۔اس پہ مستزاد یہ کہ اگر تاریخ کا مطالعہ بھی کیا جائے تو یہ خطہ کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔ بلکہ براہ راست خلافت اسلامیہ سے منسلک رہا ہے۔ کشمیر کے دفاع پر مامور افواج ترکی یا مشرقی ترکستان سے منگوائی جاتی تھیں۔پھر اک شب تاریک آئی اور یہ خطہ ارض بھی غیر مسلموں کے قبضے میں چلا گیا اور ظلم و بربریت کا ایک باب رقم ہوا۔پھر مایوسی کی شب تاریک میں اک آواز ابھری جس نے مسلمانان ہند کو جگا دیا اسی آواز نے کشمیر کے مسلمانوں کو بھی مخاطب کیا کہ: "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری" جب کشمیری مسلمانوں نے اس صدا پہ لبیک کہا تو وہاں سے پاکستان اور کشمیری عوام کی یکجہتی کا آغاز ہوا۔

زمانہ طالبعلمی سے ہی نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ زیر مطالعہ رہی ہے جسکا مفہوم ہے کہ " امت مسلمہ کی مثال ایک جسد واحد کی طرح ہے کہ جس کے ایک حصے میں تکلیف ہو تو تمام جسم اسکی تکلیف کو محسوس کرتا ہے"۔دنیا جہاں کے مسلمان ایک لڑی میں پرو دیے گئے ہیں انہیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی گوشتے میں کوئی مسلمان تکلیف میں ہو گا تو دیگر تمام مسلمان اسکی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھیں گے اور اس درد کا درماں کریں گے۔ جب تک مسلم امت اتحاد و یگانگت کا مظہر بنی رہی وہ قوت کی علامت بنی رہی مشرق سے لے کر مغرب تک ایک دوسرے کے درد کو محسوس کیا جاتا رہا۔ اور جب ذاتی، علاقائی

لسانی اور معاشی مفادات کے پردے دلوں پہ پڑے تو یہ امت بھی پارہ پارہ ہو گئی اور ہم اغیار کی کھینچی ہوئی لکیروں پہ فقیری کرنے لگے ۔امت کے اتحاد کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے امت کے ہمدردوں نے کوششیں کیں اور بیداری ملت کی تحریکیں اٹھائیں ان بیدار مغز افراد میں حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی آواز سب سے نمایاں ہے جو پکارتے ہیں کہ :

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

اقبال نے امت مسلمہ کے درد کی دوا کے طور پہ نظریہ پاکستان پیش کیا۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ امت مسلمہ کے لیے ایسی ریاست قائم کی جائے جو انہیں فکری، علمی، سیاسی انحطاط سے نکال کر دوبارہ عروج پہ لے جائے اور تمام امت کو یکجا کر سکے ۔علامہ کا خواب انکی زندگی میں تو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا البتہ قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان ایک آزاد و کودمختار ریاست کے طور پہ دنیا کے نقشے پہ ابھرا۔ قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے والے عناصر کی زبان پہ ایک ہی نعرہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ ۔مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے بعد یہ واحد ریاست تھی جو کلمہ طیبہ کے نام پہ بنائی گئی ۔ ریاست جموں و کشمیر مسلم اکثریت نے بھی پاکستان جیسے شجر سایہ دار کی چھاؤں میں اپنا مستقبل محفوظ جانا مگر اس وقت کی طاغوتی قوتوں کو کشمیر یوں

کی پاکستان سے یکجہتی ہضم نہ ہوئی۔انہوں نے ایک سازش کے تحت بھارت کو کشمیر تک جانے کا راستہ دیا بعد ازاں ہندوستان نے مہاراجہ ہری سنگھ کی درخواست پہ کشمیر پہ چڑھائی کر دی۔ اس یلغار کا مقصد پاکستان کو کمزور کرنا تھا۔ کشمیر پاکستان اور اس وقت تک انگریز تسلط سے بچی رہنے والی ریاست مشرقی ترکستان (موجودہ سنکیانگ) کے درمیان واقع ہے بھارتی جارحیت کا مقصد لیس رابطے کو توڑنا تھا۔دوسرا مقصد پاکستان کی سرزمین کو سیراب کرنے والے دریاؤں کو بھارتی قبضے میں دے کر پاکستان کی اقتصادی شہ رگ کو کاٹنا تھا۔ کشمیری عوام نے اس سازش کو بھانپ لیا اور مسلح بغاوت کے ذریعے آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کی بنیاد رکھی۔ کشمیری عوام کی مسلح جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کے طور پہ ریاست سوات کے مسلح لشکر اور پنجاب کے سکاؤٹس کشمیر پہنچے۔ بھارت یہ مسئلہ اقوام متحدہ لے گیا اور اقوام متحدہ نے جنگ بندی کرا دی اور ساتھ ہی کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کی قرارداد بھی منظور کرا لی۔ اب سات دھائیوں کی مدت بیت گئی مگر استصواب رائے کے کوئی آثار نہیں۔

صورتحال یہ ہے کہ کشمیر کے بڑے حصے پہ بھارتی افواج کا ناجائز قبضہ ہے انسانی خون کی ارزانی اور حقوق کی پامالی ہے۔ ریاست کی مسلم اکثریت نے اس ناجائز قبضے کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور اسکے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔ وہ مسلسل زبان، قلم اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے اقوام عالم کو اپنی طرف متوجہ

کرتے رہے مگر شنوائی نہ ہوئی۔ 1989 میں تحریک آزادی کشمیر نے ایک موڑ لیا اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھارت کے غیر قانونی قبضے کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ آج کل سیکولر طبقہ اسے مذہبی انتہا پسندی کی پیداوار قرار دے رہا ہے مگر حقیقت امر یہ ہے کہ اس مسلح جدوجہد میں قوم پرست تنظیمیں، سیکولر تنظیمیں اور مذہبی تنظیمیں جوش اور جذبے کے تحت میدان عمل میں کودی تھیں۔ مگر جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے محرک کی ضرورت ہوتی ہے وہ مذہبی جماعتوں میں نظریے اور نصب العین کی صورت موجود ہوتا ہے جبکہ سیکولر طبقہ اس سے خالی ہوتا ہے لہٰذا سیکولر طبقہ جلد ہی ہمت ہار گیا جبکہ مذہبی جماعتوں نے جہاد جاری رکھا۔ اس عسکری جدوجہد کے دوران کشمیریوں کی بڑی تعداد نے آزاد کشمیر اور پاکستان کا رخ کیا۔ حکومتوں کی عدم توجہ کے باوجود پاکستانی عوام نے کشمیری عوام کے ساتھ بھرپور یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ مجاہدین کے ساتھ مالی تعاون کیا گیا۔ خواتین نے اپنا زیور اور بعض افراد نے اپنے لخت جگر پیش کیے۔ میں ایسے افراد کو ذاتی طور پہ جانتا ہوں جنہوں نے اپنے بیٹوں کو جہاد کشمیر کے لیے بھیج دیا اور وہ وہاں جا کر شہید ہوئے۔ ہر طرف نعرے لکھے نظر آتے تھے۔ پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔لاالہ الااللہ، آزادی کی قیمت کیا۔۔۔لاالہ الااللہ کشمیریوں سے رشتہ کیا۔۔۔لاالہ الااللہ، گویا تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ، کشمیری عوام اور پاکستانی عوام کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ۵ فروری یوم یکجہتی کشمیر، کشمیری عوام کی

پاکستان کے ساتھ دلی وابستگی اور قربانیوں کو یاد رکھنے کے لیے منایا جاتا ہے۔
جہاں تک تعلق ہے پاکستانی عوام کا ان کے دل کشمیریوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں، مگر ہمارے حکمرانوں کا سیاسی قبلہ درست نہیں جسکی وجہ سے یہ مسئلہ ابھی تک زیر التوا ہے۔ ہمارے سروں پہ ایسے حکمران مسلط ہیں جو امت کا درد رکھتے ہی نہیں۔ سابق فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف نے تو خون شہیداں پہ مٹی ڈال دی۔ بھارت کو لائن آف کنٹرول پہ باڑ لگانے کی اجازت دے دی۔ آر پار آنے جانے والے راستے مسدود ہونے کی وجہ سے تحریک آزادی کشمیر کو بہت نقصان پہنچا۔ اور "سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ لگا کر کھود کو امت مسلمہ سے کاٹ دیا۔ اس طرح کے اقدامات سے یکجہتی کی فضا آلودہ اور مکدر ہو کر رہ گئی ہے۔ ۵ فروری کو یوم یکجہتی منانا بھی ایک رسم ہی بن کر رہ گئی ہے۔ دوسری جانب میڈیا میں بھی اس مسئلے کو صرف ایک سرحدی تنازعہ کے طور پہ پیش کیا گیا ہے حالانکہ یہ پاکستان کی تکمیل اور بقا کی جنگ ہے۔ آج پاکستانی قوم اندھیروں میں ڈوب رہی ہے اور بھارت پاکستانی دریاؤں پہ ڈیم بنا کر ہمارا پانی بھی بند کر رہا ہے۔ ہماری زراعت کہ خطرہ ہے اور ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم محفوظ ہیں۔

اس صورت حال میں ہمارا فرض ہے کہ مسئلہ کشمیر کو امت مسلمہ کے مسئلے کے طور پہ اجاگر کرائیں ۔ امت مسلمہ کو باور کرائیں کہ کشمیر سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ تمام امت مسلہ کا مسئلہ ہے ۔ تمام مسلم ممالک کو اس مسئلے کے حل کے لیے اپنا ہمنوا بنایا جائے اور مشترکہ حکمت عملی کے تحت علمی.برادری پہ دباؤ ڈال کر اسے حل کیا جائے ۔ اس سلسلے میں بھرپور سفارتی کاوشوں کی ضرورت ہے کشمیری عوام کی جدوجہد کی سفارتی اور اخلاقی حمایت خوب ڈٹ کر کی جائے اور خود کو تحریک آزادی کشمیر کا پشتیبان ثابت کیا جائے۔ تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ طالب علموں میں اس مسئلے کی اصل روح اجاگر کریں تاکہ ہماری نوجوان نسلاس مسئلے سے آگاہ ہو اور اسکے حل کے لیے سنجیدہ ہو۔ میڈیا کی ذمہ داری تو موجودہ دور میں دوچند ہو گئی ہے مگر ہمارا میڈیا بد قسمتی سے بھارت یاترا اور امن کی آشا کے گن گا رہا ہے ۔ اور یہاں تک آزاد ہو گیا ہے کہ پاکستان کی اسلامی اساس کو بھی سوالیہ نشان بنا ڈالا ہے ۔ خدارا پیمرا اہلکار اسکا نوٹس لیں اور میڈیا کو لگام دی جائے اور ضابطہ اخلاق کا پابند کیا جائے۔ میڈیا کی ذمہ داری ہے کہ وہ کشمیر کے معاملے کو پاکستانی پس منظر میں اجاگر کریں ۔ اگر ہم بحیثیت قوم غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر اس مسئلے کے حل کی کوشش کریں تو وہ وقت دور نہیں جب ہم کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزاد کرا دیں ۔ ان شاء اللہ کشمیریوں کی قربانیاں رنگ لائیں گی اور کشمیر پہ آزادی کا سورج ضرور طلوع ہو گا۔

آسمان ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اسقدر ترنم آفریں ہوگی بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

جیل۔۔۔۔تعذیب خانہ یا تہذیب کدہ

کسی بھی ریاست کو چلانے کے لیے قانون سازی کی جاتی ہے۔قوانین وضع کیے جاتے ہیں اور ریاست کے تمام افراد ان قوانین کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کا احترام کیا جاتا ہے۔اور جب تک ریاست کے افراد اور ادارے ان قوانین کا احترام کرتے ہیں تب تک کاروبار ریاست صحیح سمت میں گامزن رہتا ہے۔اور جہاں کہیں قانون شکنی ہوتی ہے تو ریاست حرکت میں آتی ہے اور تادیبی کاروائی کرتی ہے۔ریاست میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری پولیس کے محکمے پہ عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی جرم کو ہونے سے روکے لیکن اگر کوئی قانون شکنی کا مرتکب ہو جاتا ہے تو یہ بھی پولیس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مجرم کو عدالت کے کٹہرے میں لائے اور عدالت کے فیصلے کے مطابق اسے سزا دی جائے۔اس مقصد کے لیے جیل خانہ کا نظام وضع کیا جاتا ہے جو پولیس کے محکمے کے تحت چلایا جاتا ہے۔اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجرموں کو سزا دی جائے تاکہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہیں اور قانون شکنی نہ کریں۔مجرموں کو سزا دینے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ معاشرے کے دیگر افراد کو بھی قانون شکنی کے مضمرات سے آگاہ کیا جائے۔

کسی بھی مجرم کو جرم سے باز رکھنے کے لیے دو راستے اختیار کیے جا سکتے ہیں ایک ترغیب کا دوسرا ترھیب کا جیل میں دونوں طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔

البتہ مختلف النوع ریاستوں کی طرف سے مختلف رویے سامنے آتے ہیں۔ فلاحی و اصلاحی ریاستوں میں مجرموں کو بھی ملک کا شہری تصور کیا جاتا ہے اور ان کے حقوق متعین کیے جاتے ہیں۔ انہیں ایسا ماحول فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کیے پہ نادم ہوں اور جرم کی دنیا سے خود کو علیحدہ کر لیں اور ملک و قوم کے لیے مفید ثابت ہوں۔ جبکہ دوسری جانب جبروتی اور نوآبادیاتی نظام ہے جہاں مجرم کو مجرم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور اسے ایذا رسانی کے ذریعے دیگر انسانوں کے سامنے ذلیل و خوار کیا جاتا ہے اور حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ اسے نشان عبرت بنا دیا جائے۔

اگر ہم دین کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دین نے سزا و جزا ایک نہایت ہی متوازن تصور پیش کیا ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ ہمارا دین ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ سزا و جزا کا مالک صرف اللہ تعالی ہے، اس نے سزا و جزا کے لیے دن متعین کیا ہے جس دن ہر انسان کو اپنے کیے کا حساب دینا ہے اور کوئی بھی مجرم اس دن بچ نہ پائے گا۔ دوسری جانب ریاست پہ یہ ذمہ داری بھی عائد کی ہے کہ وہ ایسا ماحول فراہم کرے جس میں کوئی بھی شہری جرم کی طرف آمادہ ہی نہ ہو اور پھر بھی جو لوگ کھلے بندوں حدود اللہ سے تجاوز کریں انہیں سزائیں دی جائیں تاکہ معاشرے کے دیگر افراد ان کے شر سے محفوظ رہیں اور جرم کا دائرہ کار وسعت اختیار نہ کر سکے۔ اسلام امر بالمعروف و نہی عن

المنکر کا فریضہ عائد کرتا ہے تاکہ نیک اور صالح افراد معاشرے میں نیکی کو عام کریں اور برائی سے لوگوں کو منع کریں۔ اسکے باوجود بھی اگر کچھ لوگ سرکشی پہ اتر آئیں تو ان کے لیے کڑی سزائیں بھی تجویز کرتا ہے۔

اب اگر ہم وطن عزیز کے جیل خانہ جات کا جائزہ لیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہم جس حد تک اسلامی و فلاحی مملکت ہونے کا دعوی کرتے ہیں ہمارے ملک کی جیلیں اس کے اتنا ہی متضاد تصور پیش کرتی ہیں۔ انگریز کے نوآبادیاتی دور کے جیل نظام کو تا حال بدلا نہیں جا سکا۔ ہماری جیلیں خوفناک اور عبرت ناک ضرور ہیں مگر مصلح نہیں ہیں۔ وہاں کا ماحول ایک بے گناہ قیدی کو بھی مجرم بنا دیاتا ہے۔ جیل سے باہر آنے پہ قیدی کے دل میں قانوں کا احترام ہوتا ہے اور نہ ہی کسی سزا کا کوئی خوف۔ مجرموں پہ روا تشدد انہیں پر تشدد بنا دیتا ہے۔ اور معاشرے کا نفرت انگیز رویہ اسے مزید سماج دشمن بنا دیتا ہے۔ جیل میں رہنے سے وہ صرف ایک فن کا ماہر بن پاتا ہے اور وہ ہے قانون شکنی ۔ جیل میں رہنا گویا اسے قانون شکنی میں تجربے کی سند عطا کر دیتا ہے۔ اگر ہم مغربی ممالک کی جیلوں پہ نظر دوڑائیں تو وہ سہولیات سے آراستہ نظر آتی ہیں۔ وہاں خوف و دہشت کا راج نہیں لیکن قیدی رہا ہونے کے بعد معاشرے کا باوقار شہری بن جاتا ہے۔ وہاں قیدیوں کی فکری تربیت (کونسلنگ) کی جاتی ہے اور ذہنی طور پہ انہیں جرم سے آزاد کرایا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں تو جسمانی سزاؤں

کے بجائے نفسیاتی طریقۂ علاج سے احساس جرم پیدا کیا جاتا ہے اور اخلاقی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اقدار کو چھوڑا اور مغرب کے غلام ہوئے۔ جو زنداں فرنگی حکمت کا دو صدیوں میں تعمیر ہوا تھا ہم خود اسکے پہرے دار بنے بیٹھے ہیں۔ ہمارے سفید آقا جا بھی چکے ہیں مگر ہم اب تک ان کے اسیر ہیں۔ نہ تو ہم نے اپنے اقدار کو بحال کیا اور نہ ہی اپنے سفید آقاؤں کے فلاحی نظام کو اپنا سکے۔ ہم بس انکے وارث بنے انہی کے نوآبادیاتی ورثے کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ہماری جیلوں میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ لوگ جرم کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ وہ بھٹک جاتے ہیں ایسے میں انہیں راہ راست پہ لانا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کی اپنے شہریوں کو صحیح اور غلط میں فرق کرنے والی تعلیم فراہم کریں، انہیں جرم و سزا سے آگاہی دلائیں انکے اذہان جرم کے خلاف تیار کریں اور ایسا ماحول فراہم کریں کہ لوگ جرم کے راستے کو اختیار ہی نہ کریں۔ جیلوں کو تربیت گاہ بنائیں تاکہ بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جایا جاسکے۔ جیل میں قید افراد کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا بند و بست کیا جائے۔اس حوالے سے ملک کی دینی و مذہبی تنظیموں اور نفسیاتی ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں۔ ان کے ذریعے دعوتی اور تربیتی پروگرامات کا انعقاد جیل میں کرایا جائے تاکہ ان کی ذہنی حالت بدلی جائے۔ ہماری مذہبی

جماعتوں کو بھی چاہیے کہ وہ مسجدوں میں حاضر ہونے والے افراد تک خود کو محدود نہ کریں بلکہ ان افراد کو خصوصی ھدف بنائیں یہی لوگ حقیقت میں اصلاح کے حقدار ہیں ۔اسی طرح اگر فلاحی اداروں سے معاونت حاصل کرکے فنی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کیا جائے تو یہی افراد معاشرے کے بہترین افراد ثابت ہو سکتے ہیں اور اپنے پاؤں پہ کھڑے بھی ہو سکتے ہیں ۔اگر ہماری حکومت اخلاص کے ساتھ جیل اصلاحات پہ غور کرے اور سنجیدگی سے اس معاملے پہ کام کرے تو معاشرے سے جرائم کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے ۔اللہ سے دعا ہے کہ مقتدر طبقے کے دلوں میں اتر جائے میری بات۔آمین۔

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے

دور جدید میں کسی بھی ملک کے اقتصادی پہیے کو ترقی و خود انحصاری کی جانب رواں دواں رکھنے کے لیے توانائی کی اہمیت مسلمہ ہے۔ توانائی میں خود کفالت ہی کسی ملک کی معاشی خود انحصاری کی ضمانت دے سکتی ہے۔اللہ تعالی نے روئے ارض پہ بے شمار نعمتوں کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے اور تمام تر مادی اشیاء کو اسکے لیے مسخر کیا ہے تاکہ وہ ان نعمتوں کو کام میں لائے اور اسکی بندگی کا حق ادا کرے۔ اللہ کی یہ نعمتیں قدرتی وسائل ہیں جنکے مثبت استعمال سے انسان ضروریات زندگی حاصل کرتا ہے اور اپنی زندگی کو پر سکون بناتا ہے۔ دور جدید کی انتہائی اہم و بنیادی ضرورت توانائی کے حصول کے لیے عموماً پانی، معدنی تیل، قدرتی گیس اور کوئلے جیسی قدرتی نعمتوں کو ذریعہ سمجھا جاتا ہے اسکے علاوہ آج کل جوہری توانائی کو بھی توانائی کے حصول کا اہم ذریعہ گردانا جاتا ہے۔دنیا کے ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا بھر میں قدرتی گیس و معدنی تیل کے ذخائر رواں صدی کے نصفِ ثانی تک معدوم ہو جائیں گے اسی لیے وہ توانائی کے حصول کے لیے متبادل ذرائع تلاش کر رہے ہیں۔اللہ تعالی نے ہمیں وطن عزیز پاکستان جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے اگر اسے قدرتی وسائل کی فراوانی کے اعتبار سے جنت سے تشبیہ دی جائے تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا مگر ہمارے مقتدر طبقے کی عاقبت نا

اندیشی کی وجہ سے یہ خطۂ ارض مسائلستان بنا ہوا ہے۔ ہر نوع کے قدرتی وسائل سے بہرہ مند ہونے کے باوجود وطن عزیز توانائی کے بحران کا بری طرح شکار ہے، گھروں کے چراغ گل ہیں سڑکوں اور گلیوں میں تاریکی کا راج ہے، بازار اور تجارتی مراکز بدحالی کا شکار ہیں صنعتوں اور کارخانوں کے پہیے رکے ہوئے ہیں اور غربت ہر قریہ ہر گاؤں رقص کناں ہے۔

پانی کو توانائی کے حصول کا سب سے بنیادی ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ آبی ذخائر کو یکجا کر کے اس سے توانائی کا حصول قدیم اور ارزاں طریقہ ہے۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے سدا بہتے دریا عطا کیے ہیں جن کی موج رواں میں توانائی کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ ان دریاؤں پہ ڈیموں کی تعمیر سے تقریباً 50000 میگاواٹ بجلی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن ہم مجموعی طور پر 6654 میگاواٹ پن بجلی حاصل کرنے کا انتظام کر پائے ہیں تاہم پن بجلی کے موجودہ منصوبوں سے حاصل کردہ بجلی عموماً 2414 میگاواٹ سے 6654 میگاواٹ کے درمیان ہی رہتی ہے۔ ملکی کل پیداوار میں پن بجلی کا تناسب 1990 تک 70 فیصد تھا جو گھٹ کر 30 فیصد رہ گیا ہے۔ اور خشک سالی کے دنوں میں تو یہ 20 فیصد سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ اس تناسب میں کمی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پیداواری صلاحیت کم ہو گئی ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اس صلاحیت میں اضافہ نہیں کیا گیا اور تیل سے بجلی پیدا کرنے والے گران قیمت منصوبوں پہ اکتفا

کیا گیا۔ پن بجلی کے بڑے منصوبے فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں لگائے گئے اسکے بعد کی حکومتوں نے اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ بڑے منصوبوں کی تعمیر سے توانائی حاصل کرنے کے بجائے انہیں صوبائی منافرت کا ذریعہ بنا کر ووٹ حاصل کیے جاتے رہے اور چھوٹے منصوبے افسر شاہی کی شاہ خرچیوں اور کمیشن مافیا کی نظر ہوتے رہے۔ دریائے سندھ اور اسکے معاون دریاؤں پہ کئی چھوٹے بڑے ڈیم تعمیر کرنے کی گنجائش ہونے کے باوجود انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ اگر ڈیم نہ بھی بنائے جائیں تب بھی ملک کے پہاڑی علاقوں میں ندیوں پہ اور میدانی علاقوں میں نہروں پہ پن چکی نما بجلی گھروں کے جا بجا جال سے خاطر خواہ مقدار میں بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مقتدر طبقے اور افسر شاہی کے باہم گٹھ جوڑ نے تیل سے بجلی پیدا کرنے والے انتہائی مہنگے منصوبے شروع کیے جو غریب عوام پہ بے پناہ بوجھ بھی ہیں اور ان کی غربت کے ساتھ کھلا مزاق بھی۔

دنیا میں توانائی کے حصول کے لیے کوئلے کہ بھی اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں اسوقت 929 ارب ٹن کوئلے کے ذخائر ہیں۔ پاکستان میں 185 ارب ٹن کوئلے کے ذخائر موجود ہیں جو دنیا کا تیسرا بڑا ذخیرہ ہے۔ پاکستان میں موجود کوئلے کے یہ ذخائر 400 ارب بیرل تیل کے برابر ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ ذخائر سعودی عرب اور ایران کے میں پائے جانے والے تیل

کے مجموعی ذخائر کے برابر ہیں۔ دنیا بھر میں مجموعی طور پر کوئلے سے حاصل کردہ بجلی کا تناسب 40 فیصد ہے۔ جبکہ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ اتنی بڑی نعمت ہاتھ میں ہونے کے باوجود ہم کوئلے سے محض 200 میگاواٹ بجلی حاصل کر رہے ہیں جو اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہے۔ اگر ہم قدرت کے اس تحفے کا صحیح استعمال کریں تو ہم غیر ملکی تیل پہ اٹھنے والے خرچ سے بھی بچ سکتے ہیں اور اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر عوام کو سستی بجلی فراہم کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں موجودہ حکومت نے صحیح سمت میں پہلا قدم اٹھایا ہے جسکے تحت 1000 میگا واٹ بجلی کے منصوبے کا افتتاح کیا گیا ہے۔ اگر اس میں پیش رفت جاری رکھی جائے تو گیس اور تیل کو مکمل طور پہ کوئلے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان دنیا کے جس خطے میں واقع ہے اسے مشرق کہا جاتا ہے اور مشرقی ممالک کی خوبی یہ ہے کہ یہاں سورج اپنی آب وتاب سے چمکتا ہے۔ پاکستان میں ہر طرح کا موسم پایا جاتا ہے اور ہر موسم میں سورج کی کرنیں یہاں نور بکھیرتی ہیں۔ لیکن وہی ہماری بد قسمتی اور مقتدر طبقے کی نااہلی کہ ہم اس نعمت کو بھی حصول توانائی کا ذریعہ بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ پاکستان میں اوسطاً 19 جاؤل فی مربع میٹر سالانہ کے حساب سے سورج کی شعائیں پڑتی ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان میں شمسی توانائی سے بجلی حاصل کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے

۔ اگر بنجر اور غیر آباد رقبے کو شمسی توانائی سے بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تو اس سے حاصل کردہ بجلی تمام دنیا کو فراہم کیا جا سکتا ہے تاہم یہ ٹیکنالوجی مہنگی ہے۔ اگر حکومت یہ لازم کر دے کہ شہری علاقوں کی رہائشی سکیموں میں ہر عمارت اپنے لیے شمسی توانائی کا بندوبست کرے تو اس سے ہر مکان اور دکان بجلی کے معاملے میں خود کفیل ہو سکتے ہیں۔اسی طرح دنیا میں ہوا کو بھی توانائی کے حصول کا ذریعہ مانا گیا ہے اور دنیا کے مختلف ممالک میں ہوائی بجلی بھی حاصل کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے ساحلی علاقوں کی باد نسیم کو توانائی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔اب تک کے حکومتی سروے کے مطابق صرف سندھ کے ساحلی علاقوں میں مجموعی طور پر 11000 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی طرح ملک کے شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں ہوائی چکیوں (باد میل) کے ذریعے بجلی کی بڑی مقدار پیدا کی جا سکتی ہے۔ باقی تمام ذرائع سے حاصل کردہ توانائی میں ماحولیاتی آلودگی کا خطرہ موجود رہتا ہے جو ایک عالمی مسئلہ ہے۔ شمسی توانائی اور باد میلی توانائی سے حاصل کردہ توانائی میں ماحولیاتی آلودگی کا خطرہ نہیں رہتا۔

پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے جہاں مادی وسائل کی فراوانی عطا کی ہے وہاں باصلاحیت دماغ کے حامل اہل علم و فن بھی عطا کیے ہیں انہی باکمال افراد کی جہد مسلسل کی بدولت پاکستان دنیا کی ساتویں جبکہ ملت اسلامیہ کی واحد جوہری

قوت بنا ہے۔ پاکستان نے دفاعی میدان میں اپنی جوہری صلاحیت کا لوہا منوا لیا ہے لیکن بد قسمتی سے یہی جوہری صلاحیت بجلی کے بحران کو کم کرنے میں استعمال نہیں ہو رہی۔ دنیا کی مجموعی توانائی میں جوہری توانائی کا حصہ 16 فیصد ہے جبکہ وطن عزیز میں اس صلاحیت سے محض 812 میگاواٹ بجلی پیدا ہو رہی ہے جو ملکی پیداوار کا 4 فیصد ہے۔ پاکستان کی حکومت کو چاہیے کہ ایٹمی صلاحیت کو حصول توانائی میں نمایاں حصہ دے تاکہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاسکے۔

پیداوار میں فقدان کا رونا ہی کیا کم ہے کہ اس پہ مستزاد بجلی چوری اور دوران ترسیل بجلی کا ضیاع بھی وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ ملک کے بڑے شہروں میں حکومت کے منظور نظر لوگ اپنی آسائشیں پوری کرنے کی خاطر ملکی خزانے کو لوٹ رہے ہیں اور انکی دیکھا دیکھی عام افراد بھی اس دھندے میں ملوث ہیں۔ مہنگائی کے بوجھ تلے دبے افراد نے حکومت کی ناانصافیوں سے بدلہ لینے کا یہ آسان حل ڈھونڈ لیا ہے کہ توانائی کو حسب آرزو استعمال میں لایا جائے اور بل بھی ادا نہ کیا جائے تادیبی کاروائی پر احتجاج اور توڑ پھوڑ کی جائے۔ بعد ازاں محکمے کے افراد کچھ لے دے کر بل معاف کر دیتے ہیں اور پہلے سے بل ادا کرنے والے صارفین کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ ظلم پہ ظلم کا سلسلہ ہے جسکی وجہ سے ملک میں لوڈشیڈنگ ہے صنعتیں مفلوج ہیں اور لوگ دن بدن بے روزگار ہوتے جا رہے ہیں۔

اگر وسائل اور مسائل کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ہم وسائل کے کوہ ہمالیہ پہ بیٹھ کر بھی مسائلستان میں رہ رہے ہیں۔ ہماری حکومتوں نے ان مسائل کے حل پہ کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وطن عزیز کی بھولی بھالی عوام نے رہزنوں کو اپنا رہبر گردانا اور ملک کی زمامِ کار ہمیشہ انہی ننگِ وطن افراد کے ہاتھوں میں تھماتے رہے اور یہ حکمران دونوں ہاتھوں سے ملکی دولت سمیٹ کر اپنی تجوریاں بھرتے رہے۔ ساٹھ کی دھائی کے بعد توانائی کے حوالے سے کوئی دور رس منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ جب 90 کی دہائی میں اس مسئلے نے سر اٹھانا شروع کیا تو اس کے حل کے لیے پالیسیاں بنائی گئیں۔ 1994، اور 2013 میں توانائی کے حوالے سے پالیسیاں ترتیب 2010، 2008 ، 1998 دی گئیں لیکن اگر ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو ان میں اخلاص کا کوئی پہلو کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ بد انتظامی کا عالم یہ ہے کہ وافر مقدار میں ملکی وسائل ہونے کے باوجود اُن ذرائع سے توانائی کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے جو ملک میں دستیاب ہی نہیں اور اُن کی خریداری پہ ملک کا کثیر زرِ مبادلہ صرف ہوتا ہے۔ ملک کی 65 فیصد یعنی 13637 میگاواٹ بجلی گیس اور تیل سے حاصل کی جا رہی ہے۔ جب پیداوار بڑھانے کی بات آتی ہے تو نجی شعبے میں تیل سے بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں پہ دولت لٹا دی جاتی ہے یا پھر کاروباری مصروفیات کو کم کرکے یا

گھڑی کی سوئیاں آگے پیچھے کرکے یا ہفتے میں ایک سے زائد چھٹیاں منا کر بجلی بچانے کے ا
نتہائی غیر مقبول ٹوٹکے آزمائے جاتے ہیں۔ اگر ہم متبادل ذرائع کے استعمال سے بجلی پیدا
کرنے کے منصوبے بناتے تو آج نہ صرف ہم توانائی کے شعبے میں خود کفیل ہوتے بلکہ
اپنے ہمسایہ ممالک کے مسائل کو حل کرنے میں بھی ان کے مدد و معاون ہوتے۔ اس
نازک صورت حال میں حکمرانان وقت پہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ملک
سے بدعنوای اور چوری کا خاتمہ کریں اور توانائی کے حصول کے لیے قومی اتفاق رائے پہ
مبنی جامع و قابل عمل پالیسی ترتیب دیں جسکے تحت قلیل المیعاد اور طویل المیعاد منصوبوں
کے ذریعے وطن عزیز کو توانائی مین خود کفیل بنایا جاسکے۔ اگر حکمران سنجیدگی سے اس
مسئلے کے حل کے لیے کوشاں ہو جائیں تو وہ وقت دور نہیں کہ پاکستان دنیا میں ترقی کی
: علامت بن جائے اور اقبال کے اس خواب کو بھی تعبیر مل جائے

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

تھر تھراہٹ

۲۲ ہزار مربع میل پہ تن تنہا حکومت کرنے والے حکمران کو رعایا نے روتے اور آنسو بہاتے دیکھا۔ وجہ دریافت کی تو اس سخت جان صحرا نشین نے ورع کی حالت میں کہا " اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاسا مر گیا تو اس کا حساب عمر سے لیا جائے گا" ۔ یہ ہے تاریخ اسلامی کا درخشندہ باب جب خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر فاروقؓ جیسا مقرب صحابی بھی اس خوف کا شکار ہے کہ رعایا کو درپیش کسی بھی تکلیف کی ذمہ داری انہی پہ عائد ہوتی ہے اور اللہ کے سامنے اسکے جوابدہ ہوں گے۔ مگر اسی امت مسلمہ پہ اب ایسے حکمران براجمان ہیں جو بے حسی ، لاپروائی اور بربریت کی مجسم تصویر ہیں ۔

پاکستان کے صوبہ سندھ میں ایک صحرا ہے جسے تھرپارکر کہتے ہیں ۔ یہ دور جدید میں صحرائی زندگی کی علامت ہے ۔ اگر کوئی قدیم دور کی جھلک دیکھنا چاہے تو وہ تھرپارکر دیکھے جو غربت اور بے بسی کی علامت ہے ۔ جہاں آج بھی بارش کا جمع شدہ بدبودار پانی پیا جاتا ہے ، جہاں آج بھی اونٹ ہی سواری کا ذریعہ ہیں ، جہاں آج بھی خس و خاشاک کی جھونپڑیاں انسانی زندگی کا پتہ دیتی ہیں ، جہاں آج بھی خانہ بدوشی ہے ، جہاں آج بھی بھوک کا راج ہے اور افلاس رقص

کناں ہے۔ بارانی علاقہ ہونے کی وجہ سے انسانی، حیوانی اور نباتاتی حیات کا کلی انحصار بارش پہ ہی ہے۔ اگر یہ بارش نہ ہو تو زندگی بھی قحط کا شکار ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال اس سال بھی درپیش ہے، بارش کی قلت کی وجہ سے تھرپارکر قحط کا شکار ہے ۔لوگ قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہیں اور اموات واقع ہو رہی ہیں۔ ہلاک شدگان میں زیادہ تعداد بچوں کی ہے۔ اب تک 200 سے زائد افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور بقیہ حالات کے رحم و کرم پہ اپنی باری کے منتظر ہیں۔ یہ سب اچانک نہیں ہوا اس سے قبل مال مویشیوں کی اموات نے بگل بجا دیا تھا مگر سندھ ثقافتی میلہ کے سریلے سروں نے حکمرانوں کے کانوں میں اس بگل کی آواز پہنچنے ہی نہیں دی۔ ابھی کچھ ہی روز قبل یہاں وزیر اعظم پاکستان، وزیر اعلی سندھ اور سابق صدر زرداری نے جلوہ افروز ہو کر قوم کو کوئلے سے بجلی پیدا کرنے کے منصوبے کا مژدہ سنایا تھا۔سب نازاں و فرحاں تھے کہ قوم کو روشنی ملے گی مگر کیا خبر تھی کہ چراغ تلے اندھیرا ہے، دنیا میں کوئلے کے تیسرے بڑے ذخیرے کے ڈھیر پہ بھوک و افلاس کا بسیرا ہے اور اسکے شکار عوام کو موت نے آن گھیرا ہے۔

عوام علاقہ کی پریشانی کی ذمہ داری تو سندھ حکومت کے سر ہے جو وہاں کے سیاہ و سفید کی مالک ہے۔ قحط کی صورتحال تو یہاں ہر سال اور سارا سال رہتی ہے مگر اصل مسئلہ بدعنوانی اور بدانتظامی کا ہے۔ گندم کے ذخائر موجود ہونے

کے باوجود غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے بھوک نے انسانی جانیں لے لیں اور سندھ حکومت اسے قدرتی آفت قرار دے رہی ہے۔ایسے وقت میں جب تھر کے عوام مسیحائی کے منتظر ہیں سندھ حکومت دھڑلے سے دعوی کرتی ہے کہ کوئی ڈاکٹر اس علاقے میں کام کرنے کو تیار ہی نہیں۔ کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ یہ کیسی حکومت ہے جو اپنے تنخواہ داروں کو عوام کی خدمت پہ مامور تک نہیں کر سکتی ؟ان عقل کے اندھوں نے ریوڑیاں اپنوں میں جو بانٹ دی ہیں۔ جن اقرباء کو نوکریوں سے نوازا گیا ہے اب انہیں صحرا کی دھوپ میں تو نہیں جھونک سکتے۔اور ان سے پوچھے بھی کون ؟ عوام تو ایسے بھولے ہیں کہ انہی سانپوں کی پوجا کر رہے ہیں جو انہیں بارہا ڈستے چلے آ رہے ہیں وہ انہی کے گیت گا رہے ہیں اور انہی کے لیے زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔،

کچھ روز قبل سندھ کی دھرتی پہ موئنجوڈرو کی تہذیب اجاگر کرنے کے لیے میلے (سندھ فیسٹیول) کا انعقاد کیا گیا اربوں روپے کی عوامی دولت سے ایک دھما چوکڑی سجائی گئی اور مغربی تہذیب کا رقص ابلیس برپا کیا گیا اور اس سب کو سندھ ثقافت قرار دیا گیا ۔عین اسی وقت تھر کے عوام بھوک اور افلاس کے ہاتھوں موت کو گلے لگا رہے تھے۔ شاید پیپلز پارٹی کی اعلی قیادت مصمم ارادہ کر چکی ہے کہ سندھ کی ثقافت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک موئنجوڈرو کافی نہیں اسلیے تھر میں دوسرا موئنجوڈرو قائم کیا جائے تاکہ آئندہ نسلیں بھی

یاد کریں کہ تھرپارکر میں بھی کسی تہذیب کدہ کے آثار ہیں جو کسی کی بدتہذیبی اور چنگیزیت کا شکار ہو گیا۔کاش کہ موئنجو ڈرو کے کھنڈرات سے کوئی تو عبرت ہمارے حکمرانوں کو ہوئی ہوتی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سندھ کے حکمران قائم علی شاہ کا تعلق تو ایسے خانوادے سے ہے جسکے بزرگوں نے حق کی صدا بلند کی تھی اور کربلا میں فرات کے کنارے اپنی جانیں قربان کی تھیں لیکن شاہ صاحب کی حکومت نے یہ یزیدیت اور فرعونیت کیونکر برپا کی۔ایسا لگتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنان نے متفقہ طور پہ حیاء کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا ہے۔وزیر اعظم کی آمد پر پر تعیش ضیافت کا اہتمام تھر کی بھوک اور افلاس کے ساتھ مذاق نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

ایسی نازک صورتحال میں لبرل طبقے کے کرتوت تو عوام کے سامنے ہیں۔ تھر کے عوام کے زخموں پہ اگر کسی نے مرہم رکھا ہے تو وہ ملک کا مذہبی طبقہ ہے جسے انتہا پسندی اور دہشت گردی کا محرک قرار دیا جاتا ہے۔مذہبی تنظیموں خاص کر جماعت اسلامی نے تھر کے عوام کے مسئلے کو سمجھا ہے اور اس کے حل کے لیے عملی کام بھی کیے ہیں۔ ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے امدادی قافلے روانہ کر دیے ہیں۔امدادی سامان کی تقسیم کے لیے ٹیمیں بھی روانہ کر دی ہیں۔اسی طرح ڈاکٹروں کی ٹیمیں بھی روانہ کی گئی ہیں جو خدمت خلق کے جذبے سے وہاں امدادی سرگرمیاں انجام دے رہی ہیں۔اس کے علاوہ مستقل بنیادوں پہ

پانی کے مسئلے کے حل کے لیے نعمت اللہ خان صاحب نے پیرانہ سالی میں اپنی کاوشیں کی ہیں۔ زمزم پراجیکٹ کے تحت 600 سے زائد کنویں کھودے جا چکے ہیں تاکہ تھر کے عوام کو میٹھا اور صاف پانی دستیاب ہو سکے۔ علاقے کی پسماندگی دور کرنے کے لیے تعلیمی اداروں کا نیٹورک بھی کام کر رہا ہے۔ اگر ارباب حکومت سنجیدگی کا مظاہرہ کریں اور یہ کاوشیں حکومتی سطح پہ کی جائیں اور دیانت داری کو اپنایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان کا کوئی بھی علاقہ پسماندگی کا شکار ہو۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس دشت میں پنہا کوئلے کی دولت کو عوام علاقہ کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنائے اور صدہا سال سے پسماندہ علاقے کو ترقی و روشنی کا گہوارہ بنائے۔ آمین

شیر ملت جاگ ذرا

(مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال میں پاکستان کا کردار)

کہتے ہیں کسی گڈریے کو جنگل سے شیر کا بچہ ملا تو اس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ شیر کا بچہ بھی بھیڑ بکریوں میں رل مل گیا اور پل کر جوان ہو گیا۔ ایک دن ریوڑ پہ جنگل کے شیر نے حملہ کر دیا۔ ریوڑ کا شیر بھی بھیڑ بکریوں کی طرح جان بچانے کے لیے بھاگا۔ اپنے ہمزاد کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر جنگل کے شیر کو غصہ آیا اس نے ریوڑ کے شیر کو آ لیا۔ وہ اسے پکڑ کر پانی کے تالاب پہ لے آیا اور اسے اپنا عکس دکھا کر کہا کہ تم اپنی اصلیت دیکھو تم شیر ہو لیکن حرکتیں بکریوں والی کر رہے ہو۔ تمہیں تو میرا مقابلہ کرنا چاہیے تھا لیکن تم نے بکریوں کی طرح دوڑ لگا دی۔ جب کوئی اپنی حقیقت سے آشنا نہ ہو تو ذلت اور رسوائی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ کچھ ایسا ہی ہماری قوم اور ملک کے ساتھ بھی ہے۔ ہم ایشیا کا شیر ہو کر بھی عالمی طاقتوں کے رحم و کرم پہ ہیں۔ وہ ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے چلے جا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ آئینہ دیکھنے سے ہی گریزاں ہیں شاید وقت کی دھول میں اٹے اپنے ہی عکس سے خوفزدہ ہیں۔

پاکستان کو اللہ نے بہترین محل وقوع اور جغرافیے سے نوازا ہے۔ خطے میں پاکستان کی اہمیت مسلّم ہے اسکی سرحدات مغرب میں ایران اور افغانسان، شمال میں چین، مشرق میں بھارت سے ملتی ہیں جبکہ جنوب میں گرم پانیوں سے لبریز بحیرہ عرب ہے جو اہم تجارتی گزرگاہ ہے۔ ایران کے مغرب میں عرب ممالک واقع ہیں جو تیل کی دولت سے مالا مال ہیں اور ان کا شمار ہمارے دوست ممالک میں بھی ہوتا ہے۔ ایران سے ہمارے تعلقات اونچ نیچ کا شکار ضرور رہے ہیں تاہم اس کے ساتھ بھی برادرانہ تعلقات استوار ہیں۔ مشرق وسطیٰ کا یہ خطہ تیل کی دولت اور گرم سمندروں کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے عالمی طاقتوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ روس اور امریکہ کی نظریں انہی وسائل پہ جمی ہوئی ہیں۔ اسی مقصد کے تحت پہلے روس نے افغانستان پہ یلغار کی اور اب امریکہ اپنے مغربی اتحادیوں کے ساتھ افغانستان اور عراق پہ قابض ہے۔ اس صورتحال میں پاکستان ان ممالک کے اتحادی کے طور پہ کام کر رہا ہے اور ہمیں ڈو مور (Do More) کہہ کر ہانکا جا رہا ہے اور ہم یہ ادراک کرنے سے ہی قاصر ہیں کہ ہم بھی ایک قوت ہیں اور ہمارا بھی ایک کردار ہے جو اس کردار سے یکسر مختلف ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔
عالمی طاقتیں خطے کے ممالک کی نبض سے آشنا ہو چکی ہیں اس لیے انہوں نے دکھتی رگ پہ پنجے گاڑھ دیے ہیں۔ لیکن امت مسلمہ کی بدنصیبی ہے کہ اسکے حکمران تاریخ سے کوئی سبق سیکھنے کو تیار ہی نہیں۔

خطے کے وسائل پہ براجمان ہونے کی واحد سبیل یہ ہے کہ اس علاقے میں خونریز تصادم کرایا جائے اور خطے کے ممالک کو باہم دست و گریبان کر دیا جائے۔ آگ کا یہ الاؤ بھڑکانے کے لیے انہیں فرقہ واریت کی شکل میں ایندھن بھی بآسانی دستیاب ہے۔ سعودی عرب اسلامی ممالک میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ حرمین الشریفین کی موجودگی اسے دینی و مذہبی اہمیت عطا کرتی ہے اسکے علاوہ سنی عقیدہ کے مسلمانوں کے لیے بھی سعودی عرب ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری جانب ایران ہے جہاں شیعہ اکثریت ہے اور انقلاب ایران کے بعد تو ایران دنیا بھر کے شیعہ مسلمانوں کے لیے نہایت ہی مقدم ہو چکا ہے۔ یہ مسلکی تفاوت ان دو ممالک کے مابین سیاسی عداوت کا روپ دھار چکی ہے۔ اس کا اظہار دونوں ممالک وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں مثلاً عراق میں شیعہ سنی فسادات میں دونوں نے اپنے مسلک کے لوگوں کی امداد کی، شام کی خانہ جنگی میں بھی دونوں اپنے حلیفوں کی امداد کر رہے ہیں، لبنان، بحرین اور شمالی یمن میں بھی یہی صورتحال ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی وطن عزیز کی گلیوں میں فرقہ واریت کی پشت پناہی بھی یہی دو ممالک بڑی شدومد سے کر رہے ہیں۔ یہ صورتحال بدترین جنگ کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے اور شدید ترین داخلی انتشار کا سبب بھی۔ اس صورتحال کا فائدہ وہی مغربی ممالک اٹھا رہے ہیں جو وسائل پہ نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ مسلسل اس آگ کو ہوا دے رہے ہیں تاکہ ان کے مقاصد جلد پایہ

تکمیل کو پہنچ سکیں۔

اگر خطے کی صورت حال کو سامنے رکھ کر ہم تاریخ پہ بھی سرسری نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ خلافت عباسیہ کے زوال کے وقت بھی بعینہٖ یہی صورت حال تھی۔ جب چنگیز خان کے ٹڈی دل لشکر نے خوارزم پہ حملہ کیا تو خلیفہ نے خوارزم کی مدد اسلیے نہیں کی کہ یہ حملہ بغداد پہ نہیں خوارزم پہ ہوا ہے اور جب بغداد کا محاصرہ ہوا تو شیعہ سنی مخاصمت رنگ لائی اور اسلامی تہذیب کا گہوارہ عبرت کا نشان بن گیا۔ بالکل اسی طرح جب افغانستان پہ مغربی چنگیزیوں نے ھلہ بولا تو ہمارے شیر کی کھال میں چھپے گیدڑ صفت حکمران نے 'سب سے پہلے پاکستان' کا نعرہ لگایا اور فریب خوردہ شاہیں نے کبوتر کی طرح آنکھیں موندھ لیں۔ عالمی طاقتوں نے اتحادی ہونے کا دلاسہ دیا اور ہم ان کے ہو رہے۔ اب ہم دہشت گردی کا شکار بھی ہیں اور یہی مغربی سرکار ہمیں اس دہشتگردی کا محرک اور مجرم بھی قرار دے رہی ہے۔ اس وقت تک ہمارے چالیس ہزار سے زائد افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں لیکن غفلت کی عنودگی اس قدر ہے کہ ہوش آنے کا نام تک نہیں لینے دیتی۔ کاش کہ ہمارے حکمران وقت کے آینے میں اپنی تصور دیکھ سکیں اور اپنا کردار ادا کر سکیں۔

ایسی نازک صورت حال میں پاکستان کے حکمرانوں پہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی

ہے کہ وہ ملکی اور علاقائی مفادات کا تحفظ کریں۔ اس وقت امت مسلمہ کی امیدیں پاکستان سے وابستہ ہیں۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور امت کا نگہبان بھی۔ پاکستان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ حرم کی پاسبانی کے لیے امت مسلمہ کو ایک کر سکتا ہے۔ پاکستان عرب ممالک (خصوصا سعودی عرب) اور ایران کے درمیان بننے والی نفرتوں کی خلیج میں پل کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ پاکستان کو چاہیے کہ اس وقت فریق بننے کی بجائے ثالث کا کردار ادا کرے۔ امت کے دو گروہوں کو باہم دست و گریباں ہونے سے بچائے اور انہیں باہم شیر و شکر کرے۔ اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرے اور عالمی شازشوں کے سامنے بند ھ باند ھنے میں اپنا کردار ادا کرے۔ اس وقت پاکستان کے تعلقات دونوں طرف کے ممالک سے بہتر ہیں۔ پاکستان کو اپنی سفارتکاری میں بہتری لانے کی ضرورت ہے اور خطے کے ممالک سے تعلقات مثالی بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے حکمران اپنا صحیح کردار ادا کرتے ہیں تو تاریخ انہیں جمال الدین افغانی جیسے قائدین کی صفوں میں شمار کرے گی اور اگر اب بھی غفلت سے کام لیا گیا تو ہماری داستان تک نہ ہو گی داستانوں میں۔

اگر پاکستان سعودی عرب اور ایران کے درمیان مفاہمت اور دوستی کی فضا قائم کر دیتا ہے تو خطے میں اس کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔ شام میں برسرپیکار متحارب گروہ بھی ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، لبنان ، یمن، بحریں میں

بھی امن کی راہیں کھلیں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وطن عزیز کی گلیوں میں فرقہ وارانہ قتل و غارت گری میں بھی کمی آئے گی۔ علاوہ ازیں علاقائی تجارت کو فروغ ملے گا اور ایک دوسرے کے وسائل کے استعمال سے ترقی کی نئی راہیں کھلیں گی۔ ایشیائی ممالک بھی ترقی کے میدان میں مغربی ممالک کے ہم پلہ آ جائیں گے اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ قومی سطح پہ اتفاق رائے کے ساتھ ایک متفقہ خارجہ پالیسی ترتیب دے جو تمام طبقات کی نمائندگی کرتی ہو۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ ہم چین جیسے قابل اعتماد دوست کے ساتھ مل کر دنیا کے دیگر ممالک کو بھی اپنا ہمنوا بنائیں۔ دنیا ہماری عسکری و جوہری صلاحیت کا لوہا مان ہی چکی ہے اب ہمیں ایسا کردار ان کے سامنے پیش کرنا ہے کہ وہ ہماری بات بھی مانے۔ اپنی عزت اور ناموس کو زندہ رکھنے کا یہ ایک نادر موقع ہے اگر یہ موقع ہاتھ سے گنوا دیا تو صدیوں اس کی تلافی نہ ہو پائے گی۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ احساسات مقتدر طبقے کے دلوں میں اتار دے تاکہ امت سکھ کا سانس لے سکے۔ آمین۔

لطفِ خیال

(اپنے ایک دوست خیال نواز کی دشنام طرازیوں پہ لکھا ایک افسانچہ)

ارے یہ خیال کی دنیا بھی کیا ہی عجیب دنیا ہے یا پھر خیال دنیا کی کوئی عجیب مخلوق ہے۔ کل میری خیال سے تکرار نہیں ہوئی ایسا لگا جیسے آج پانی کے تالاب میں کسی نے کنکر نہیں پھینکا۔ لہریں نہیں اٹھیں ارتعاش نہیں پیدا ہوا۔ ہر جانب سکتہ کی کیفیت تھی کیا مجال کہ کوئی چڑیا ہی پر مار کر اس سکوت کو توڑ دیتی۔ ماحول میں شاید کسی عفریت کی آمد ہوئی تھی جس کی دہشت سے چہار جانب ہراسیمگی کا راج تھا۔ لیکن یہ خیال کی دنیا کیونکر بدلی ہوئی تھی ؟ یہ آج بے حس و حرکت کیوں تھا۔ اس کے سکوت نے آج تکرار کی فضا کو ہی معدوم کر ڈالا تھا۔ بظاہر یہ مقام سکون و اطمینان تھا مگر یہ سکون تو اجنبی تھا شاید۔ جسم کے ہر انگ میں درد محسوس ہونے لگا طبیعت بوجھل ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کسی اجنبی غذا نے طبیعت کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ حکیم بدپرہیز نے بتایا کہ معاملہ ایسا نہیں ہے اصل میں درد میرے سر میں ہے اور تمام جسم اسے محسوس کر رہا ہے۔ دردِ سر کی وجہ یہ سامنے آئی کہ جسم کی طرح ذہن بھی کچھ چیزوں سے مانوس ہو جاتا ہے اور میرا ذہن خیال کے تیر و نشتر کا عادی ہو چلا

تھا اب کہاں یہ سکوں کی فضا۔ جب تیر و نشتر میسر نہ آئے تو ذہن نے درد کا اظہار کیا اور یہ تکلیف جان سارے بدن میں محسوس ہوئی۔ سکون کی تلاش میں تو آج ہر نفس ہی ہے لیکن جب یہ سکوں مجھے ملا تو معلوم ہوا کہ یہ تو درد دل کی دوا نہیں بلکہ خود ایک درد سر ہے۔ اس میں بھی ایک راز مضمر ہے۔

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

حدِ ادب

دنیا کی کوئی بھی ریاست اسی صورت میں چل سکتی ہے جب اسکے ادارے اپنے اپنے دائرہ عمل میں رہتے ہوئے اپنے فرائض منصبی کلی طور پہ سرانجام دے رہے ہوں۔ جہاں کہیں بھی کوئی ادارہ اپنی ذمہ داریوں سے تغافل کا مرتکب ہوگا وہیں ریاست کمزور پڑنا شروع ہو جائے گی۔ اور اگر ادارے اپنی حدود سے تجاوز کریں گے تو اداروں کے مابین تصادم ہوگا جو ریاست ہے لیے خطرناک ہے۔ اس لیے ریاست کے امور کو بہترین اسلوب پہ رواں رکھنے کے لیے اداروں کو قوائد و ضوابط بنائے جاتے ہیں اور حدود و قیود کا تعین ہوتا ہے تاکہ ہر ادارہ اپنی ذمہ داری احسن طور پہ انجام دے سکے۔ وطن عزیز کے اداروں پہ نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یا تو اداروں کی حدود متعین نہیں ہیں یا پھر ان کی پاسداری کروانے کا کوئی معقول انتظام ہی نہیں ہے۔ ایک طرف ہمیں ریلوے، پی آئی اے اور سٹیل مل جیسے ادارے نظر آتے ہیں جو اپنی ناقص کارکردگی کی بنیاد پہ ملکی وسائل پہ بار گراں بن گئے ہیں تو دوسری جانب فوج، عدلیہ اور میڈیا جیسے ادارے نظر آتے ہیں جو اپنی حدود سے تجاوز کرکے حکومت کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔

میڈیا کو موجودہ دور میں ریاست کا اہم ستوں گردانا جاتا ہے اس ادارے کاکام اقوام عالم کے سامنے اپنے ملک کا تشخص پیش کرنا اور اپنی ریاست کا لوہا منوانا ہے۔ میڈیا زبان، قلم اور کیمرے سے مسلح ہوتا ہے اور ان ہتھیاروں کے ذریعے اپنے وطن کی تصویر دنیا کے سامنے اجاگر کرتا ہے۔اسی ابطالی تصور کے نتیجے میں (Heroic)ابطالی دیگر اقوام عالم اس ملک سے اچھے یا برے روابط و مراسم قائم کرتے ہیں اور اپنے سفارتی و تجارتی تعلقات استوار کرتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملکی میڈیا کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اپنا فرض نبھا رہا ہے اور نہ ہی اپنی حدود و قیود کا لحاظ کر رہا ہے۔ ہمارے میڈیا نے آزادیٔ اظہار کی آڑ میں پہلے سیاست دانوں کو نشانہ بنایا اور دنیا کو باور کرایا کہ ہماری سیاست، پارلیمنٹ اور سیاستدان تو کوئی کردار نہیں رکھتے، پھر عدلیہ اور ہر دلعزیز ججوں کو دنیا میں بدنام کیا گیا اور اب پاکستان کی فوج کا تمسخر اڑایا جا رہا ہے۔ دشمن ملک کے میڈیا کو موقع اور ساتھ ہی مواد بھی فراہم کر دیا ہے کہ وہ پاکستان کے مؤقر ادارے پہ انگلی اٹھائیں اور دشنام طرازی کریں۔اب تو ملک کے ہر طبقے نے آواز لگائی ہے کہ میڈیا کو لگام دی جائے اسے حد ادب کا پابند کیا جائے۔ آزادیٔ رائے جمہوریت کا حصہ ہے لیکن آزادی کی بھی کوئی حدود ہوتی ہیں یہاں آزادی کا مطلب یہ لیا جا رہا ہے کہ جس کے منہ میں جو بھی آئے وہ بلا جھجک

کہہ دے خواہ اسکے نتیجے میں کسی کی عزت و آبرو خاک میں مل جائے۔ حالانکہ مہذب اور ترقی یافتہ دنیا میں بھی یہ کلیہ اختیار کیا جاتا ہے کہ قلم کی مثال ایک لاٹھی کی ہے جسے آپ چاروں جانب گھما سکتے ہیں مگر یہ آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے۔ ہمارے ٹی وی چینلز نے تو یہ وطیرہ بنا لیا ہے کہ ہر وقت کسی کی ٹوہ میں لگے رہنا ہے اور کوئی چنگاری ملے تو فوراً اسے ہوا دینا ہے۔ اس ادارے یا اس سے وابستہ افراد کا محاسبہ (میڈیا ٹرائل) کرنا ہے اور اسکی ناک کو زمیں پہ رگڑنا ہے۔ کوئی بھی چینل ہو وہ ملک و قوم کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا نظر آئے گا اگر کوئی منفرد اہل فن بھی مل جائے تو اس کے فن کو متعارف کرنے کے بجائے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اس فن کی پاکستان میں کوئی قدر نہیں۔ اس رویے کی وجہ سے معاشرے میں مایوسی پھیل رہی ہے اور اہل فن اس ملک سے باہر اپنا مستقبل تلاش کر رہے ہیں

۔

اصل میں میڈیا بھی ارتقائی عمل سے گزر رہا ہے قلمی صحافت اب برقی صحافت میں بدل گئی ہے۔ جرنلزم اب ماس میڈیا میں ڈھل گیا ہے اخبار کی جگہ ٹی وی چینل نے لے لی ہے قلم کی جگہ کیمرہ آگیا ہے کالم نگار کی جگہ اینکر پرسن آ گئے ہیں غرض ایک انقلاب ہے جو برپا ہو چکا ہے۔ مادی طور پہ تو صحافت نے ترقی کر لی ہے لیکن دوسری جانب اس ترقی نے صحافت کو مقام ادب سے دور کر دیا ہے۔ جب تک صحافت کا تعلق قلم سے تھا تو یہ ادب کی صنف سمجھی جاتی تھی اب کیمرے

کی وجہ سے یہ فلم اور تھیٹر کی صف میں آ گئی ہے۔ قلمکار الفاظ کا چناؤ سوچ سمجھ کر کرتا تھا اور آداب گفتگو کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایسا ادب پارہ سامنے لایا کرتا تھا جو تنقید سے بھرپور ہونے کے باوجود تضحیک سے خالی ہوتا تھا۔ لیکن برقی میڈیا تو ایک شتر بے مہار ہے جس پہ نہ کوئی سنسر ہے اور نہ کوئی ضابطۂ اخلاق بس ایک تھیٹر ہے اور جگت بازی ہے جو چرب زبانی میں سبقت لے گیا وہ کھیل میں بازی لے گیا۔ اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ قلمی صحافت پڑھے لکھے اور مہذب افراد تک محدود تھی جبکہ برقی میڈیا کا دائرہ عامۃ الناس ہیں۔ لیکن یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ میڈیا کا کام رہنمائی کرنا اور تعلیم دینا ہے جبکہ ہمارا میڈیا تو غیر تعلیم یافتہ افراد کی ڈگر پہ چل پڑا۔ اخلاقی معیار کی پستی کا یہ عالم ہے کہ معاشرتی اقدار تو دور دور تک میڈیا میں نظر ہی نہیں آتے۔ ایسا لگتا ہے کہ فلم و ڈرامہ کے اداکار آ کر ان چینلز میں بیٹھ گئے ہیں جو تعلیم و تربیت کے کسی مرحلے سے گزرے ہی نہیں۔

میڈیا کے بگاڑ کی ایک وجہ چینل مالکان بھی ہیں جن کی توجہ کا مرکز صحافت نہیں بلکہ پیسہ ہے۔ انہوں نے پیسے کو معیار مقرر کر لیا ہے۔ جس طرح کے پروگرام عوام پسند کرتے ہیں ان کے لیے زیادہ اشتہارات مہیا ہوتے ہیں اس لیے مالکان زیادہ سے زیادہ پروگرام اسی نوعیت کے ہی چلاتے ہیں۔ ان پروگرامات کے چلانے کے لیے ایسے ہی فنکار تلاش کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے تو اقدار کے

پر خیچے اڑا دیے جاتے ہیں۔ ان پروگرامات، اشتہارات، تجزیوں اور مباحثوں میں وہ کچھ دکھایا جاتا ہے جس کا ہماری تہذیب و ثقافت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا اپنی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آنا تو درکنار غیر ملکی ثقافت کو پروان چڑھایا جا رہا ہے اور اسے آزادیٔ صحافت سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ آزادی کی حدود و قیود متعین نہ ہونے کی وجہ سے میڈیا نے خود کو عفریت بنا لیا ہے اور یہ بھی ایک مافیا کی شکل اختیار کر گیا ہے ۔ میڈیا اہلکار خود کو ہر قسم کی قانونی و اخلاقی پابندیوں سے آزاد سمجھتے ہیں۔ میڈیا کا کارڈ پاس ہو تو جو جی میں آئے کر گزرو۔ بعض میڈیا اینکرز نے تو خود کو چیف جسٹس آف پاکستان سمجھ لیا ہے وہ جس صاحب وقار شخصیت کا انتخاب کر لیں انہیں اپنے رو برو حاضر ہونے کے لیے سمن جاری کرتے ہیں اور مطلوبہ فرد کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اینکر صاحب کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرے وگرنہ یکطرفہ طور پہ آپ کو قوم کے سامنے مجرم قرار دیا جائے گا۔ حکومت وقت پہ یہ گراں ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ موجودہ دور کے اس عفریت کو لگام دی جائے۔ میڈیا کے لیے ضابطۂ اخلاق تیار کیا جائے اور تمام چینلز کو اس ضابطے کا پابند کیا جائے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے اور ان کے لائسنس منسوخ کیے جائیں۔ تمام چینل مالکان از خود

یہ فیصلہ کریں کہ معاشرتی اقدار اور نظریۂ پاکستان سے متصادم مواد کی تشہیر نہیں کریں گے۔ اگر میڈیا کو حد ادب کا پابند کر دیا جائے اور باقی ادارے بھی اپنے دائرہ کار میں کام کریں تو وہ وقت دور نہیں جب پاکستان کا تشخص دنیا میں قائم ہوگا اور یہ اقوام عالم کی امیدوں کا مرکز ہوگا۔

پھر ایک ٹیپو کا جہاں آباد کریں

28 مئی 1998ء ایک یادگار دن تھا جب پاکستان نے اقوام عالم میں اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ تکبیر کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں اور چاغی کے پہاڑ جوہری دھماکوں سے گونج رہے تھے ۔ ہر طرف خوشی کی لہر تھی چہروں پہ ایک دھمک تھی یہاں تک کہ جیلوں میں محبوس قیدیوں نے بھی اپنی خوشی کا بھرپور اظہار کیا۔ خوشی کی اس لہر کو اہل پاکستان نے ہی نہیں بلکہ چاردانگ عالم میں موجود مسلمانوں نے محسوس کیا۔ کرتے بھی کیوں نہ ! پاکستان مسلم دنیا کی واحد اور پہلی جوہری قوت بن گیا تھا۔ جب ان خوشگوار لمحات کی یاد آتی ہے تو تاریخ دو صدیاں قبل کے ماضی کو بھی سامنے لے آتی ہے جب انگریز سامراج کے سامنے آخری چٹان بنے شیر میسور سلطان فتح علی خان ٹیپو اپنی سپاہ کے روبرو جلوہ افروز ہیں اور تکبیر کی گونج میں ایک غیر مانوس سی آواز (کشوں۔۔۔۔) آتی ہے ایک آگ کا گولہ ہوا میں بلند ہوتا ہے اور اپنے ساتھ ایک آہنی تلوار کو لیے دو تین میل دور جا گرتا ہے اور تلوار زمین میں پیوست ہو جاتی ہے ۔ یہ آہنی تلوار دنیا کا پہلا راکٹ (میزائل) تھا جو سلطان ٹیپو نے ایجاد کیا تھا۔ اسکا نام کشون رکھا گیا اور جلد ہی اسے فوج کے سپرد کیا گیا۔ اس کے چلانے کی تربیت دی گئی اور اسکے ماہر فوجیوں پہ مشتمل رجمنٹ تیار کر لی گئی ۔ سلطان کی دھاک انگریز سامراج پہ بیٹھ چکی تھی

اور سلطان کی شہادت کے بعد بھی انگریزوں کے دلوں پہ قائم رہی۔ 28 مئی کے ایٹمی دھماکوں سے یوں لگا جیسے ٹیپو سلطان کا ادھورا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہو۔اس وقت کے پاکستانی حکمران نے خود انحصاری کا نعرہ لگایا تو قوم اس کی پشت پہ کھڑی ہو گئی۔اس موقع پہ وزیر اعظم پاکستان نے علامہ اقبال کا شعر پڑھا تو الفاظ و معانی دل میں اتر گئے اور کیوں نہ اترتے جب تلوار ہاتھ میں تھام کر خود انحصاری کی بات کی جائے تو نا سمجھ بھی سمجھ جاتے ہیں اقبال کا وہ شعر یہ تھا :

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ابھی دل ودماغ ماضی کو خوشگوار لمحات کو یاد کر رہے تھے کہ تاریخ کے ورق الٹے ہیں اور 4 مئی 1799ء کا سیاہ دن سامنے آ جاتا ہے۔ سرنگا پٹم کا شکستہ قلعہ ہے اور گھمسان کی جنگ ہے سلطان کے قلعے میں اندر سے شگاف ڈالا جا چکا ہے توپوں کی گھن گرج ہے اور سلطان اپنی تلوار تھامے انگریز سامراج سے محو جنگ ہے۔ سلطان کے غلام کی صدا آتی ہے حضور آپ ہتھیار ڈال دیجیئے آپ کی جان بچ جائے گی لیکن جواب آتا ہے "شیر کے ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے" بظاہر سلطان کے یہ آخری کلمات کسی فلم یا ڈرامے کے ڈائیلاگ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ اخلاق کا مظہر اور مقصد حیات کو بیان کرتے

انمول موتی ہیں۔ سلطان کا معاصر نیپولین بوناپارٹ بھی انگریز کے لیے خار گلو تھا مگر جب قید کی زندگی یا موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو اسے کہا گیا تو اس نے قید کی زندگی گوارا کی اور انگریز کی قید میں اپنی بقیا زندگی گزاری جبکہ سلطان تو آزاد پیدا ہوا تھا اور آزاد ہی اس دنیا سے رخصت ہوا۔

جس کی کرنوں نے کئی مردے جِلائے تھے وہ مہ بامِ خودی اپنے ہی خوں میں نہا کر ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔ لیکن برصغیر پاک و ہند دو سو سال تک انگریز کی غلامی میں پستے رہے دو صدیوں کی غلامی اور ذلت کے بعد اب 28 مئی 1998ء کو ہم دوبارہ سر اٹھانے کے قابل ہوئے۔ تاریخ کے ان دو سو برسوں نے یہ سبق دیا کہ :

اکیلے پنکھ ہی کافی نہیں پرواز کی حد کے لیے
بھرا ہو حوصلوں سے عقابی اک جگر بھی چاہیے

آپ دنیا کی جدید سے جدید ٹیکنالوجی کے مالک بھی کیوں نہ بن جائیں، آپ کے حکمران کتنے ہی صاحب تدبر اور صاحب فہم کیوں نہ ہوں، آپ کو تمام عالم پہ اخلاقی برتری کیوں نہ حاصل ہو لیکن اگر آپ کی صفوں میں ایک بھی میر صادق ہو تو قوم خود کو ذلت اور رسوائی سے نہیں بچا سکتی۔ آستین کے سانپوں کا قلع

قمع انتہائی ضروری ہے۔ انگریز کو اپنا جبری تسلط قائم رکھنے کے لیے میر صادق کی طرز کے افراد کی ضرورت تھی لہٰذا انہوں نے میر صادق اور میر جعفر کی پنیریاں لگانا شروع کر دیں اور ایسا نظام تعلیم وضع کیا جو مطلوبہ افراد بہم پہنچا سکے۔ ہماری بد قسمتی یہی رہی ہے کہ ہم گزشتہ سات دہائیوں سے اس پنیری کو ختم نہ کر سکے اور نہ ہی اس نظام تعلیم سے چھٹکارا پا سکے۔ اسی لیے یہ میر صادق اور میر جعفر ہر ادارے پہ براجمان نظر آتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں اور ہم واپس اپنے دور میں آ جاتے ہیں۔ ایک شخص فوجی وردی میں ابھرتا ہے اور منتخب وزیر اعظم کا تختہ الٹ کر اسے قید کر کے خود اس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا ہے۔ پھر امریکی سامراج ہمارے برادر پڑوسی ملک افغانستان پہ حملہ آور ہوتا ہے تو یہ حکمران ایک فون کال پہ ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اپنے ملک کی سرزمیں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے قتل عام کے لیے سامراج کے حوالے کر دیتا ہے۔ ہم جو عزت و وقار کے طالب تھے ایک بار پھر بے وقار ہو جاتے ہیں۔ ہم جوہری طاقت کے ہوتے ہوئے اپنی عفت مآب بہنوں تک کو دشمن کے حوالے کر دیتے ہیں۔ دانۂ گندم کی خاطر اپنے مسلمان بھائیوں کو نیلام کر دیتے ہیں اور وہ گوانتانا موبے میں رب کے سامنے فریاد کر رہے ہیں۔ ہم اپنی ہی مسجدوں میں قتل عام کر کے اپنے امریکی آقاؤں کو خوش کرتے ہیں۔ اب وہی شخص عدالت میں سنگین غداری کے مقدمات بھگت رہا ہے اور تاریخ کے اوراق ایک اور میر صادق کے نام کا اندراج کرنے کے لیے عدالت کے فیصلے کے

منتظر ہیں۔

مئی یوم شہادت ٹیپو سلطان اور 28 مئی یوم تکبیر کے ایام ہمیں یہ سوچنے کی دعوت ۴ دے رہے ہیں کہ کس طرح ان پنیریوں کو تلف کیا جائے اور ایسا نظام وضع کیا جائے جو ٹیپو سلطان جیسے بطل جلیل پیدا کر سکے۔ ہمیں ااجڑے چمن کو دوبارہ آباد کرنا ہے اور ایسا نظام وضع کرنا ہے جو ٹیپو سلطان جیسے شاہیں پیدا کرے نہ کہ بربادیٔ چمن کے لیے ہر شاخ پہ الوصفت میر صادق بٹھا دے۔ اگر ہم جوان نسل کو خود انحصاری اور خودداری پہ مبنی تعلیم و تربیت دینے میں کامیاب ہو گئے تو مستقبل میں ہم تمام تر اقوام عالم میں نمایاں ہوں گے اور اگر ہم نے اس میں غفلت کا مظاہرہ کیا تو ہماری داستان تک نہ ہو گی داستانوں میں۔ تو پھر آیئے مل کر تعمیر کریں اجڑے گلستان کی۔

چچا چھکن کی موبائیل بیتیاں

موصوف کا اصل نام لقمان ہے عمر اور تجربے کے لحاظ سے انہیں لقمان حکیم مشہور ہونا چاہیے تھا مگر اسکے برعکس ان کی ظریفانہ حرکتوں کی بدولت انہیں لوگ چچا چھکن کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہم نے بھی چچا چھکن کی تصویر ٹانگنے والی کہانی نصاب میں پڑھی تھی جو اب قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ اب تو ہمارے چچا چھکن جدید کے قصے ہی زبان زد عام ہیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں یہ قصے بھی وقت کی دھول نہ بن جائیں ہم انہیں قلم کے ذریعے کاغذ پہ منتقل کرکے قارئیں کے لیے لطف کا ساماں کیے دیتے ہیں۔ چچا چھکن عمر کا بیشتر حصہ گزار کر اپنے تجربات، معلومات، اور فکاہیہ و معصوم حرکتوں کو لیے اکیسویں صدی میں داخل ہوئے جو کمپیوٹر اور موبائل فون جیسی ٹیکنالوجی کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس ٹیکنالوجی نے نہ صرف ابلاغیات میں ایک انقلاب برپا کیا ہے بلکہ ہماری معاشرت پہ بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہماری تہذیب و ثقافت ہی بدل گئی ہے۔ ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کی جگہ اب گھنٹوں موبائیل فون پہ بات چیت ہو جاتی ہے، خط کتابت کی جگہ SMS نے لے لی ہے نیز کیمرہ، ویڈیو، ٹی وی، گھڑی، جیسی سہولیات بھی اب اسی ایک آلے میں ڈھل چکی ہیں۔ دور جدید کے لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور دیگر اپنا معاشقہ اسی آلے کے ذریعے باآسانی انجام دیتے ہیں۔ موبائیل کمپنیوں کے پیکجز کی

بدولت اب ہر گلی ہر محلے میں نوجوان اسی لت میں پڑے نظر آتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ یہ موبائیل فون بھی کسی دل جلے نے معاشرے سے انتقام لینے کے لیے مربوط منصوبہ بندی کے تحت متعارف کرایا ہے۔ غرض ایک انقلاب ہے جس نے ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز پہ چچاکے ہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود نہ تھی البتہ ان کے ایک ہمسائے کے ہاں فون لگا تھا۔ چچاکے رشتہ داروں کو ان کا نمبر دیا گیا تھا اگر کبھی کسی رشتہ دار کو بات کرنا ہوتی تو پڑوسی کے گھر فون کرتا اور پڑوسی چچا کو بلا لاتے۔ چچا کو اس فون پہ بات کرنے کے کئی موقعے ملے مگر وہ اس سے آشنا نہ ہوئے جب بھی بات کرنے لگتے ٹیلیفون کا ریسیور ہمیشہ الٹا پکڑ لیتے اور پھر زور زور سے ہیلو۔۔۔۔ہیلو پکارتے ۔اور سارا محلّہ سر پہ اٹھا لیتے۔ ان کی یہ افتاد دیکھ کر صاحب خانہ ان کی داد رسی کرتے اور ریسیور سیدھا کرا دیتے۔ دور جدید کے اس نومولود جن (موبائیل فون) نے چچا کو بھی متاثر کیا۔ دیگر افراد کی دیکھا دیکھی انہیں بھی موبائل فون خریدنے کا اشتیاق ہوا۔ چچی کی جمع پونجی سے ایک اینٹ کی شکل کا موبائیل خرید لائے اور لاتے ہی گھر بھر میں اسکی نمائش شروع ہو گئی۔ چچا نے اسے کئی بار نیچے گرا کر اسکی مضبوطی کی پڑتال بھی کی۔سب اس نئے مہمان کی آمد سے بہت خوش تھے۔ہر فرد کی گردن اکڑی تھی جیسے اس میں لوہا آگیا ہو۔ چچا

چچی اور دیگر اہل خانہ بات کرتے رہے اور اپنے رشتہ داروں کو مس کال کرتے رہے بھیجتے رہے اور ایک ہی دن میں بیلنس ختم ہو گیا۔ فورا بیلنس ڈلوانے SMS کسی کو خالی پی سی او گئے اور دکاندار سے بیلنس کارڈ طلب کیا۔ دکاندار نے 200 روپے مالیت کا کارڈ پیس کیا تو چچا نے عالم حیرت میں دکاندار سے استفسار کیا " ارے میاں یہ وہی کارڈ ہے ناں جو موبائیل میں ڈالا جاتا ہے ؟" دکاندار نے اثبات میں جواب دیا تو تشفی نہ ہوئی اور دوبارہ وہی سوال کیا۔ دوکاندار نے دوبارہ یقین دلایا تو چچا نے بادل نخواستہ یقین کر ہی لیا۔اس موقع پر میاں فصیحت بھی وہیں موجود تھے چچا کو مضطرب دیکھ کر ان کے قریب آئے ۔ بعد از سلام انہیں موبائیل فون خریدنے پہ مبارکباد دی۔ چچا سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو چچا نے کہا" ارے میاں موبائیل میں پیسے ختم ہو گئے ہیں میں نے یہ کارڈ خریدا ہے لیکن یقین نہیں آ رہا کہ یہ وہی کارڈ ہے "۔ میاں فصیحت کی یقین دہانی پہ انہوں نے سوال داغ دیا ارے میاں اگر یہ مطلوبہ کارڈ ہے تو پھر یہ موبائیل میں کیونکر ڈلے گا۔۔۔ یہ کارڈ تو اتنا بڑا ہے اور موبائیل چھوٹا ہے ؟ارد گرد سننے والوں پہ تو گویا ہنسی کا دورہ پڑا البتہ میاں فصیحت نے بڑی مشکل سے خود پہ قابو پایا۔ چچا کو جیب سے سکہ نکالنے کو کہا اور سکے کی مدد سے کارڈ کھرچ کر بیلنس ڈالنے کی مفت تربیت فراہم کی ۔تربیت مکمل ہوتے ہی چچا نے گھر کی راہ لی۔

چچا نے سوچا کہ موبائیل فون کی یہ متاع انتہائی قیمتی ہے لہٰذا اس کی حفاظت کا بندوبست ہونا چاہیے۔ گھر سے باہر نکلتے تو اسے انسانی چشم بد سے محفوظ رکھنے کے لیے چچا کے تینوں صاحبزادے گارڈ کی صورت چچا کے ہمراہ رہتے۔ موبائیل فون چونکہ برآمد کیے جاتے تھے اسلیے ہمارے ملک کی آلودہ آب و ہوا کو اس کے لیے مضر تصور کیا گیا۔ فون کو گرد و غبار اور آلودگی سے بچانے کی غرض سے موبائیل کو ایک رنگین رومال میں لپیٹا گیا اور کپڑے کے خود ساختہ دستی بستے میں ڈال دیا گیا جو سر کی جانب ڈوری سے بند ہوتی تھی۔ اس دستی بستے کی تیاری میں چچی اور انکی صاحبزادیوں نے خوب مغز کھپایا تھا ۔ یہ دستی بیگ اہل محلّہ میں بے حد مشہور ہوا اُن کے ہاں تو وجہ شہرت طنزیہ تھی مگر چچا کے اہل خانہ کے اس خیال کو کاروباری دنیا میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ اگر عطر فروش (پرفیومفری) کے ہاں جائیں اور اچھا سا عطر خریدیں تو آپ کو اسی طرح کے خوشنما چھپائی والے بیگ میں پیک کر کے پیش کیا جائے گا۔ بہر حال اہل محلّہ چچا کی اس ایجاد کی قدر و قیمت سے ناآشنا تھے۔ ایک دن چچا اسی آفت کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے چل دیے۔ دوران نماز فون کی گھنٹی بجنے لگی اب چچا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کیا جائے۔ موبائیل سات پردوں میں چھپا ہوا تھا اور مسلسل بج رہا تھا۔ بعد از نماز تمام نمازیوں نے بشمول امام صاحب ان کی خوب خبر لی۔ کسی نے چچا کی سلیقہ شعاری دیکھی تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے چچا کو شفاف پلاسٹکی غلاف (Transparent Plastic

چڑھانے کا مشورہ دیا جو بازار مین مناسب نرخ پہ دستیاب تھا۔ اس نے اپنا کور (Cover) چڑھا موبائیل چچا کو دکھایا تو چچاکے من کو یہ بات بہت ہی بھائی، اس کے نتیجے میں انہیں تھیلی اور رومال میں لپٹا موبائیل بار بار کھولنے کی زحمت سے چھٹکارہ جو مل رہا تھا۔ چچا نے فوراً کور چڑھایا اور گھر کی راہ لی۔ راستے میں کسی رشتے دار کا فون آیا تو چچا نے بات کرنا چاہی مگر فون سے آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ چچا بہت پریشان تھے کہ اس بار پھر میاں فصیحت ان کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ میاں صاحب نے فون کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ موبائیل فون کے سپیکر کی جگہ پہ بنے چھید کو کریدکر کور سے جدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ میاں فصیحت نے سپیکر کی جگہ سے پلاسٹک کو کریدا تو آواز بحال ہو گئی۔

رفتہ رفتہ چچا اور ان کے اہل خانہ موبائیل فون کے تمام ہی ناز و انداز سے آگاہ ہو گئے اور یہ سب بھی ماضی قریب کا حصہ بن گیا۔ چچاکے اہل خانہ میں اضافہ بھی ہو گیا اور ان کے ہر فرد کے ہاتھ میں جدید قسم کا موبائیل آ گیا۔ چچاکے ہر دلعزیز بیٹے دلنواز کی شادی بھی ہو گئی اور اولاد نرینہ سے بھی مالامال ہو گیا۔ انہی دنوں ٹچ سکرین والا موبائیل منظر عام پہ آیا دلنواز کو بھی ایک فون پہ دل آ گیا اور اسے خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اس کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے فوری خریدا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے چچا

سے

مشورہ کیا۔ چچا نے سوچ بچار کے بعد ایک حل تلاش کیا۔ وزیراعظم نے حاطم طائی کی قبر پہ لات مار کر نوجوانوں کے لیے چھوٹے قرضے دینے کا اعلان کر رکھا تھا انہوں نے سوچا کیوں نہ قرضے کے لیے درخواست دی جائے قرض ملنے پہ موبائیل لے لیں گے بعد میں قرضی معاف کرالیں گے۔ سادہ لوح چچا کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس طرح کا قرضہ غریب لوگوں کو کہاں ملتا ہے ؟وہ دلنوان کو لیے بینکوں کے چکر لگاتے رہے مگر سعی لا حاصل۔ مناسب منصوبہ ظاہر نہ کرنے کہ وجہ سے ان کی درخواست داخل دفتر کر دی گئی۔ اس سے دلگرفتہ ہو کر دلنواز اور چچا نے مشورہ کیا اور مطلوبہ موبائیل سیٹ خریدنے کے لیے گھر کے ماہانہ بجٹ پہ غور و غوص شروع کر دیا۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ ٹماٹر، گھی اور دیگر غیر ضروری اشیائے خوردنی کے بجٹ میں کمی کی جائے اور مرغن غذاؤں میں کمی کی جائے۔ اس فیصلے پہ گھر کی خواتین نے خوب احتجاج کیا مگر چچا نے مذاکرات کے ذریعے حالات کو قابو کرلیا۔ پراٹھوں اور مرغن غذاؤں پہ پابندی کے باعث اتنی بچت تو نہ ہوئی البتہ دوستوں سے ادھار لے کر دلنواز نیا سیٹ لینے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ چچا کے اہل خانہ نے اس موبائیل فون کا بھی بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ رات بھر گھر پہ محفل کا سماں تھا سب باری باری موبائیل کی سکریں پہ مخصوس انداز سے انگشتِ شہادت کا مَس کر رہے تھے ایسے لگ رہا تھا جیسے سب کے سب موبائیل می سے سیدھی انگلی کے ساتھ گھی نکالنے کا فن جان گئے ہیں جو ان روزمرہ کی غذاؤں سے بچت کی غرض سے کم کر دیا گیا تھا۔ موبائیل

فون میں ایک رنگ ٹون ایسی بھی تھی جو بچے کی کے رونے کی آواز پہ مشتمل تھی یہ ٹون سب کو بے حد پسند آئی سب اسے بار بار سنتے تھے اور ہنسی مذاق کرتے تھے۔رات تاریک ہوئی تو صحن میں ہی سب لوگ سو گئے۔ دلنواز بھی موبائیل چارج پہ لگا کے سو رہا۔ فجر کے قریب دلنواز کا بیٹا چارپائی سے گر پڑا اور رونے لگا۔ شور سن کر ہر ایک نے دل نواز کو آواز دی کہ اس وقت موبائیل بند کرو اور ہمیں سونے دو۔دلنواز بھی بڑبڑایا کہ کسی نے میرے موبائیل پہ بچے والی ٹون کا الارم کیوں لگا دیا اور ٹٹول کر موبائیل فون بند کرنے لگا۔ اس وقت اس پہ یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ یہ الارم موبائیل فون کا نہیں بلکہ اسکے فرزند ارجمند کی بانگ سحر ہے جو انھوں نے اپنا درد سنانے کے لیے بلند کی ہے۔چچا چھکن کی ظریفانہ طبیعت ان کے وارث میں منتقل ہو چکیں۔اب یہ معلوم ہوا ہے کہ صرف جاگیر، سیاست اور شرافت ہی وراثت میں نہیں ملا کرتیں بلکہ ظرافت پر بھی موروثیت کا عمل دخل بدرجہ اتم موجود ہے۔ دور خواہ کوئی بھی ہو اس میں چچا چھکن موجود ہونا چاہیئں کیونکہ ان کی وجہ سے ہر طرف مسکراہٹیں بکھر جاتی ہیں ۔یہی لوگ تو زندگی کی علامت ہیں کیونکہ زندگی تو فی الحقیقت وہی ہے جو ہنس مکھ رہ کر گزاری جائے۔ لوگوں کو ہنساتے رہنے کی بھاری ذمہ داری دلنواز کے کندھوں پہ ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اگلی نسل کے لوگوں کو کس حد تک کھلکھلا سکتا ہے۔

اک اذان جو داستان ٹھیری

13) جولائی یوم شہداء کشمیر (شہداء اذاں) کے حوالے لکھی ایک تحریر۔ دنیا کی انوکھی آذان کی داستان آزادیٔ کشمیر کے ان پروانوں کے نام جو ایک عظیم مقصد کی خاطر اپنی جان پہ کھیل گئے)

سری نگر کی خاموش فضاء میں اللہ اکبر اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کی دلربا صدا بلند ہوئی تو ساتھ ہی ڈوگرہ فوج کی جانب سے گولی کی تڑتڑاہٹ بلند ہوئی۔ سنسناتی ہوئی گولی مؤذن کو اسی رب سے ملانے کا ذریعہ بن گئی جس کی کبریائی کا ڈنکا اس نے بجایا تھا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ کا سورج سری نگر میں ایک نئی تاریخ لے کر ابھرا۔ چشم فلک نے اس روز وہ منظر دیکھا جو اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ سری نگر کی مرکزی جیل کے سامنے لوگوں کا ہجوم جمع ہے۔ یہ سب لوگ کسی خبر کے منتظر لگتے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل ہوتی چلی جا رہی ہیں اور اسی انتظار میں سورج بھی مائل بہ زوال ہو گیا۔ نمازِ ظہر کا وقت ہوا تو تمام افراد نے ادائیگی نماز کے لیے جیل کے باہر ہی جماعت کھڑی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک نوجوان اذان دینے کے لیے آگے بڑھا اور قبلہ رخ ہو کر اذان شروع کی جو اس کی شہادت کا باعث بنی۔ اذان کی آواز

تو ہر مسجد کے میناروں سے دن میں پانچ وقت بلند کی جاتی ہے مگر ان کی جزاء یہ تو نہیں ہوتی پھر اس اذاں میں کیا تھا جو موت ہی اس کی سزا ٹھہری۔ اصل میں یہ اذاں کسی روایتی ملّا نے نہیں بلکہ بیدار مغز مجاہد نے دی تھی جو الفاظ میں تو اسی طرح تھی مگر ملا کی اذاں سے مختلف تھی اور طاغوت و جبروت کو یہ اذاں پسند نہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن

ملا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور

رب سے ملاقات کا یہ انوکھا و منفرد انداز دیکھ کر ایک اور جوان آگے بڑھا اور وہیں سے اذاں کے سلسلے کو دوبارہ شروع کیا جہاں اس کے پیش رو نے چھوڑا تھا۔ پھر تکبیر کی صدا بلند ہوئی اور ساتھ ہی ایک گولی کی آواز آئی اور یہ شخص بھی فردوس کے بالاخانوں کی طرف عازم سفر ہو گیا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذت آشنائی

دوسرے شخص کو بھی رب سے ملاقات کرتے دیکھا تو تیسرا جوان آگے بڑھا اور آذان کے منقطع سلسلے کو آگے بڑھایا اور فضاء میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز بلند ہوئی جواب میں ایک اور گولی آئی اور اس شاہد کو شہید کے رتبے پہ

فائز کر گئی۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مؤمن

نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ڈوگرہ فوج اس اذاں سے مشتعل ہو گئی ہے حالانکہ مشتعل ہونے کے لیے آذان تو کوئی خاص وجہ نہیں۔ لیکن درحقیقت وجہ یہی اذاں تھی۔ یہ وہ نغمہ ہے جو تخت وتاج ہلا دیتا ہے۔ یہ تو اعلان ہے کہ اللہ کے بندو! بندوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی بندگی میں آجاؤ اسی میں فلاح ہے۔جب یہ نغمہ کان کے راستے سے دل میں اتر جائے تو انسانی ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ زندہ و بیدار ضمیر فرد کسی کا غلام بنانا ناممکن ہو جاتا ہے وہ صرف ایک خدا کی غلامی میں آجاتا ہے۔ وہ مخلوق خدا کی بندگیوں سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی بندگی میں پناہ گزین ہوجاتا ہے۔ یہی بات تو خود کو خدا سمجھنے والے عاقبت نااندیش ظالموں کو پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابولہب و ابو جہل ایک صادق و امیں ہستی ﷺ کی زبان سے لاالہ الااللہ کا جملہ سن کر اس کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں جبکہ بلال حبشی اسی کلمے کو دل میں اتار کر سیدنا بلالؓ ہو جاتے ہیں۔جب یہ نغمہ جبر کے ایوانوں میں گونجتا ہے تو اسے اپنے تخت کے پایوں میں ارتعاش محسوس ہوتا ہے وہ طاقت سے اس نغمے کی صدا کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی سب کچھ یہاں بھی ہو رہا تھا۔ ہم سب مسجدوں میں، خانقاہوں میں اور

اپنی خلوت کی عبادتگاہوں میں لا الٰہ الا اللہ کا وِرد تو کرتے ہیں لیکن مزہ تو تب ہے جب اس کا اظہار کسی طاغوت کے سامنے کیا جائے۔ اسی لیے تو جابر کے سامنے کلمہ حق ادا کرنے کو افضل جہاد قرار دیا گیا ہے۔

ہے کہ اندر نج رہا سازِ سخن
نعرۂ لا پیش نمرود جبر

یہ سب لوگ سری نگر جیل کے سامنے ایک مقدمے کی کاروائی سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ان کا مطالبہ تھا کہ مقدمے کی کاروائی ان کے سامنے کی جائے اور انہیں فیصلے سے آگاہ کیا جائے۔ مقدمے کا مرکزی کردار عبد القدیر نامی شخص تھا جس کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا اور یہ ایک انگریز کے ہاں ملازم تھا جو سری نگر میں رہتا تھا۔ اس سے زیادہ اس شخص کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ عبد القدیر پہ کشمیریوں کو ڈوگرہ حکومت کے خلاف ورغلانے کی کوشش کے جرم میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔اس سے چند روز قبل ہی جموں کی جامع مسجد میں نماز عید کے خطبے کے دوران مولوی صاحب نے فرعون و موسیٰؑ کا ذکر کیا۔فرعون کے جبر ناروا کے قصے سن کر مسجد کے باہر کھڑے ڈوگرہ فوجیوں کو یہ گمان ہوا کہ یہ تو ڈوگرہ سرکار کا ذکر ہو رہا ہے بس ہری سنگھ کی جگہ فرعون کا نام لے کر عوام کو مہاراجہ سرکار کے خلاف بغاوت پہ آمادہ کیا جا رہا ہے۔ قرآن پاک کا معجزہ دیکھیے کہ وہ ہر دور کے فرعون اور نمرود کو بے نقاب کرتا ہے ۔قرآن

پاک نے لوگوں کی ہدایت کے لیے تمثیلیں بیان کر دیں ہیں اور ان کا انجام بھی بتا دیا ہے۔ فرعون اور نمرود ہر دور میں موجود ہوتے ہیں ان کے سامنے جب قرآن پاک کی یہ تماثیل بیان کی جائیں تو وہ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ اصل مخاطب کون ہے۔ڈوگرہ فوجی سیخ پا ہو کر مسجد میں داخل ہو گئے اور مولوی صاحب کو خطبہ بند کرنے کو کہا۔ انکار کرنے پہ مولانا صاحب سمیت نمازیوں پہ تشدد کیا گیا اور قرآن پاک کی بے حرمتی کی گئی۔ امتحان تو یہ ہوتا ہے کہ کون ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے اسوہ کو اپناتا ہے اور کون محو تماشائے لبِ بام رہتا ہے۔جو بھی مشکل کی گھڑی میں اس اسوہ کو اپنائے گا وہ کامیاب ہو جائے گا۔

قرآن پاک کی بے حرمتی کے واقعے کے خلاف پوری ریاست جموں وکشمیر میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ جگہ جگہ احتجاج ہونے لگے۔ اسی طرح کے احتجاجی جلسے کے دوران عبدالقدیر نامی پٹھان اٹھا اور ایک جوشیلی تقریر کر ڈالی۔ تقریر میں اس نے عوام کو مخاطب کرکے کہا کہ جب تک سامراج سے آزادی حاصل نہیں کر لیتے اس طرح کے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔ یہ وہ تقریر تھی جس کی پاداش میں عبدالقدیر کو گرفتار کیا گیا اور اس پہ اشتعال انگیزی کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا 13 جولائی کو اس مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا تھا اور یہ سب لوگ اس فیصلے کے منتظر تھے کہ نماز ظہر کا وقت ہو گیا۔ عبد القدیر کو تین ماہ کی

سزا ہوئی اور بعد از رہائی وہ تحریک آزادیٔ کشمیر کو بنیاد فراہم کرکے خود تاریخ کی بھول بھلیّوں میں گم ہو گیا۔جب عبد القدیر پہ مقدمہ چل رہا تھا تو شاید اسے یہ معلوم بھی نہ ہو کہ اس کی خاطر کتنے دل ڈھڑک رہے ہیں ۔ اسکے دیے ہوئے بیداری کے درس نے کتنوں کو بیدار کر دیا تھا اور انھوں نے تاریخ کی وہ اذاں دے ڈالی تھی جس کے متعلق اقبال نے فرمایا تھا :

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

دنیا کی تاریخ کی انوکھی اذاں دی جا رہی تھی ایک کے بعد ایک جوان آگے بڑھتا اور کلمۂ حق ادا کرتے ہوئے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیتا۔ اذان کی تکمیل میں 22 افراد اپنی جان کی بازی ہار گئے ۔ لیکن اپنی قوم کو اس اذاں کے ذریعے نئے مفاہیم عطا کر گئے ۔جب وہ تکبیر کہہ رہے تھے تو گویا اعلان کر رہے تھے کہ کشمیر پہ اقتدار اعلیٰ کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے ، جب وہ شہادتیں ادا کر رہے تھے تو ببانگ دہل کہہ رہے تھے کہ اس سرزمیں پہ وہی نظام چلے گا جو اللہ کے رسول ﷺ کا مکمل دین کی صورت میں ہم تک لائے ہیں ، جب وہ حی علی الصلاۃ کہتے تو گویا پکار رہے ہوتے تھے کہ بندوں کی غلامی چھوڑ کر رب العباد کی بندگی اختیار کرو ، جب حی علی الفلاح کی صدا بلند کرتے تو کہہ رہے ہوتے تھے کہ کامیابی تو اس چلن میں ہے جس کی جانب ہم پکارتے ہیں ۔ ہم صدا

لگاتے ہیں ہم تمہیں بلاتے ہیں آؤ ہمارے راستے پہ تم بھی کامیاب ہو جاؤ گے۔

عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

تاریخ کے اس عجیب واقعے نے حالات کا رخ ہی بدل ڈالا۔ تحریک آزادیٔ کشمیر کو ایک بنیاد فراہم ہو گئی۔ ان 22 افراد نے اپنی جانوں پہ کھیل کر آزادی کی ایک شمع فروزاں کی۔ ان کی اذانِ حق پہ لاکھوں فرزندان توحید نے لبیک کہا۔ اپنے گھر بار قربان کیے ہجرت کی، اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اب بھی اپنی تحریک کو جاری رکھے ہوئے ہیں،، باطل کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں اور طاغوت کا مقابلہ صبر اور پامردی سے کر رہے ہیں ۔ یہ تحریک مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ لاکھوں افراد جان کی قربانی دے چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ دنیا بھر میں مقیم کشمیری ان شہدا کو یاد کرتے ہیں اور 13 جولائی کو یومِ شہداء کشمیر منایا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر میں تعطیل ہوتی ہے۔ شہداء کی لازوال قربانیاں جن کے نتیجے میں آج ہم آزاد و خود مختار مملکت میں بیٹھے ہیں ہم سے یہ سوال کر رہی ہیں کہ ہم تو دین پہ کٹ مرے تھے کیا ہمارے بعد تم نے ہمارے مشن کو تا پنی جان ،مال اور قویٰ کے ذریعے تقویت دی ؟، ہمارے حکمرانوں سے سوال کر رہی ہیں کہ ہمارے خون کو نظر انداز کرکے ہمارے ہی دشمنوں سے دوستی کی پینگیں چے معنی دارد؟ اور میڈیا کے اہلکاروں

سے یہ سوال کر رہی ہیں کہ ہم تو دین پہ کٹ مرے آپ کو ہماری قربانی کے کس گوشے پہ شک ہے کہ اس تحریک کا رشتہ دین سے جوڑنے کے بجائے آج یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ یہ جدوجہد دینی تھی یا سیکولر؟ جس خطۂ ارضی کو مسجد بنانے کے لیے ہم نے اذان دی تھی جب پاکستان کی صورت میں وہ مسجد معرض وجود میں آ گئی تو قوم بحیثیت مجموعی رب کے آگے سربسجود ہونے سے گریزاں کیوں ؟ چھوٹے بڑے، امیر غریب، کالے گورے اور ہر قسم کی تقسیم کو ختم کرکے ایک صف میں کھڑے ہونے کے بجائے صوبائیت، علاقائیت اور فرقہ واریت کی بنیاد پہ انتشار کیوں؟ رب کی عطا کردہ زمیں پہ غیر اللہ کا نظام کیوں ؟اسلام کے نظام عدل ومساوات کے بجائے استبداد کا نظام ظلم کیوں؟ ہماری معیشت کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کیوں کر رہی ہے ؟ہم نے تو غیر ریاستی شخص کی صدائے حق پہ لبیک کہا، اسکی خاطر قربانی دینے سے نہیں ٹلے اور نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر ایک امت ہونے کا عملی مظاہرہ کیا مگر مملکت خداداد میں اپنے ہی شہریوں، اپنے ہی مسلم بھائیوں کو غیروں کے ہاتھ فروخت کرکے قومی خزانہ بھرنے کی تجارت کیوں؟ اپنے ہی ملک کے شہریوں پہ غیروں کے ہاتھوں بمباری کیوں اور اس پہ تفاخر کیوں ؟ غرض ان کی اذاں فضاؤں میں گونج رہی ہے اور ہمارے ضمیروں پہ مسلسل دستک دے رہی ہے کہ خدارا ہمارا لہو بھلا نہ دینا۔ یوم شہداء کشمیر ہم سے تقاضا کر رہا ہے کہ ہمارے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بنا آرام سے نہ بیٹھ جانا۔ تحریک آزادی کشمیر کو منطقی انجام تک پہنچائے بنا نہ

چھوڑنا، کسی مصلحت پسندی کا شکار نہ ہو جانا۔ ہم نے اذاں دے دی تم کروٹ بدل کر سو نہ جانا بلکہ اقوام عالم کی امامت کرنا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شہداء کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔

شہید تم سے یہ کہہ رہے ہیں

لہو ہمارا بھلا نہ دینا

شہید کارگل لانس نائیک راجہ یٰسین جنجوعہ

خونِ شہیداں سے پھوٹتی ہے سحر

اقوام کی زندگی میں جنگ کا نہایت اہم کردار ہوتا ہے کیونکہ اس کے اثرات نسلوں تک رہتے ہیں۔ آزاد اقوام عالم کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ جنگ میں کام آنے والے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں اور جس مقصد کے حصول کے لیے فرزندان وطن قربان ہوتے ہیں اسے قومی مشن کے طور پر آگے بڑھاتی ہیں۔ وہ چاہے عروج کی جانب گامزن ہوں یا زوال پزیر ہوں مقصد کی خاطر جان ہار دینے والوں کی زندگیاں ان کے لیے نقوش پا بن جاتی ہیں۔ انہی نقوش پا کو چراغ منزل کئے ہوئے قومیں تاریکیوں میں اپنا سفر کاٹتی ہیں۔ جب بات ہو کشمیر کی ہمالیائی ریاست کی تو اس کے برفزار، مرغزار، وادیاں اور کوہ ودمن ایسے ہزاروں فرزندان توحید کو اپنے سینے میں لیے ہوئے ہیں جو اپنا خون جگر دے کر ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے اور قوم کو تاریکیوں میں نوید سحر دے گئے۔ ایسے ہی فرزندان توحید میں سے ایک راجہ یٰسین خان جنجوعہ بھی ہیں جو کارگل کو محاذ پر اپنے لہو سے ایسا چراغ روشن کر گئے جو پھوٹتی سحر تک قوم کو نشان منزل دکھاتا رہے گا۔

شہید راجہ یٰسین جنجوعہؒ ۱۹۷۴ء میں آزاد کشمیر کے مردم خیز ضلع باغ کے نواحی گاؤں چک سریاں میں پیدا ہوے۔آپ جنجوعہ قبیلے کے ایک معمولی زمیندار کے چشم وچراغ ہیں ۔ پیرانہ سالی میں اولاد نارینہ کا ملنا والدین کے لئے دنیا کی تمام تر نعمتوں اور خوشیوں پر حاوی تھا۔اسی لیے تو شہید کو انتہائی لاڈ سے پالا گیا۔ کم عمری ہی میں ان کی شادی کر دی گئی اور وہ دو بچوں کے باپ بن گئے۔آپ کمسنی سے ہی فوج کی طرف مائل تھے ۔شاید اسکی وجہ یہ تھی کہ شہید کے دادا عقل دین خان جنجوعہ دوسری جنگ عظیم میں فوجی کی حیثیت سے شریک رہے۔آپ کو بھی اس پر فخر تھا کہ دادا کے بعد خاندان میں آپ دوسرے شخص ہیں جنہوں نے فوجی ملازمت اختیار کی۔آپ پر فوج میں بھرتی کا گویا جنون سوار تھا اسی لیے مڈل پاس کرتے ہی انہوں نے فوج میں ملازمت کے لیے درخواست دی۔آپ کی کم عمری راہ میں رکاوٹ بن گئی ۔آپ کو ایک برس ٹھہرنا پڑا اور بالآخر آپ کو فوج میں ملازمت مل ہی گئی۔ذوق جہاد اور شوق راہ منزل اور زاد منزل کے طور پر NLI- شہادت سے سرشار اس کڑیل جوان کو 3 نصیب ہوئی۔

شہید کو محض فوج میں بھرتی کا شوق نہ تھا بلکہ اس نے اپنے لیے شہادت کو منزل بنا رکھا تھا۔یہی وجہ تھی کہ فوجی ملازمت کے دوران وہ اپنی شہادت کے تذکرے کیا کرتے تھے۔ شہید کو شاید اپنی شہادت پر یقین بھی تھا۔وہ شہادت سے سات ماہ قبل اپنے گھر آئے تو اپنے تمام اقارب سے اس طرح ملے گویا وہ انکی

آخری ملاقات ہو۔اس طرح جون ۱۹۹۹ء کو انہوں نے گھر والوں کو لکھے گئے خط میں اس چیز کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔

جب کارگل کے برفزاروں نے وطن کے فرزندوں کو پکارا تو یہ جانباز بھی پکار پہ لبیک کہتے ہوئے اپنا زادراہ لیے میدان کارزار کی اگلی صفوں میں پہنچ گیا۔آپ کو کارگل کی بیس ہزار فٹ بلند بلال نامی پہاڑی پر چار ساتھیوں سمیت متعین کیا گیا تھا۔دشمن اس چوٹی پر بہر صورت قبضے کا خواہشمند تھا۔اسلیے وہ اپنی چوٹی کا زور لگا رہا تھا اور آپ کو شدید نقصان پہنچا رہا تھا۔ایک روز پانچ سو بھارتی فوجیوں کے مسلح دستے نے پوسٹ پر حملہ کر دیا۔چشم فلک اس پر گواہ ہے کہ اللہ کے ان پانچ شیروں نے دشمن کے اس ٹڈیدل کے لشکر کو ناکوں چنے چبوا کر رسوائی، ذلت اور پسپائی پہ مجبور کر دیا۔جب دشمن نے یہ حملہ پسپا ہوتے دیکھا تو پچھلی پوسٹوں سے مارٹر گولوں سے حملہ کر دیا۔ایک گولہ آپ کے بھی آ کر لگا جس سے آپ کا کندھا اکھڑ گیا۔دیگر سپاہیوں نے جب دشمن کا یہ حملہ بھی پسپا کر دیا تو ساتھیوں نے آپ کو مرہم پٹی کے لیے پیچھے لانا چاہا۔ابھی آپ کو زخمی ہوئے سات منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک گولہ سنسناتے ہوئے آیا اور راجہ یٰسین جنجوعہ شہید، کیپٹن تیمور اور دیگر تین ساتھیوں کو وہ آب حیات پلا گیا جسکے پینے سے موت ہمیشہ کے لیے انسان کے رستے سے دور ہو جاتی ہے۔

موسم کی شدت کے باعث لاش کو اٹھایا نہ جا سکا۔اسی دوران اعلان واشنگٹن کا بگل بجا اور جیتی ہوئی بازی ہار دی گئی۔بڑھتے اقدام کو پیچھے آنا پڑا۔جو پوسٹ دشمن کی کیل کانٹے سے مسلح فوج ہتھیا نہ سکی وہ مذاکرات کی میز پر دشمن کی جھولی میں ڈال دی گئی ۔دشمن نے مادر وطن کے عظیم فرزندوں کی لاشوں کو بھی قبضے میں لے لیا اور ایک ماہ سے زائد اس کے قبضے میں رہیں۔جو بعد میں عالمی ریڈ کراس کے ذریعے پاکستان آئیں۔ اگست ۱۹۹۹ء کو شہید کی سبز ہلالی پرچم میں لپٹی لاش کو عوام الناس کی کثیر تعداد ۲۵ کے استقبال کے بعد فوجی اعزاز کے ساتھ بندوقوں کی سلامی کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ اگست کو باغ کے بریگیڈ کمانڈر زرین خان نے شہید کے گھر جا کر اہل خانہ کو ۲۷ زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔بریگیڈیئر صاحب نے جب شہید کے تین سالہ فرزند راجہ زریاب یٰسین سے پوچھا کہ وہ بڑا ہو کر کیا بنے گا تو اس نے فوجی وردی کو ہاتھ لگا کر معصومیت سے کہا (میں بھی ابو کی طرح فوجی بنوں گا) یہ اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ :

جئیں تو غازی جو مر جائیں تو شہید سحر
ہمیں قبول نہیں کوئی درمیان کی بات

وطن عزیز کا یہ عظیم سپوت اپنے آبائی گاؤں چک سریاں میں سبز ہلالی پرچم کی چھاؤں میں بغیر کوئی تمغہ سجائے اللہ سے رزق پا رہا ہے اور ساتھ ہی فردوس کے بالاخانوں سے ہمیں یہ پیغام بھی دے رہا ہے کہ میں تو اپنی منزل کو پہنچ گیا مگر تحریک آزادیء کشمیر کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانا اب ہمارا فرض ہے۔

شہید تم سے یہ کہ رہے ہیں لہو ہمارا بھلا نہ دینا

دہشت گردی کے خلاف سنجیدگی کا عالم

وطن عزیز پاکستان گزشتہ ایک دہائی سے بدترین دہشت گردی کے عفریت سے نبرد آزما ہے۔ دہشتگردی کے خلاف برسرپیکار قوم اب تک ساٹھ ہزار سے زائد جانوں کا نذرانہ پیش کر چکی ہے جس میں زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے قیمتی اور بے گناہ افراد شامل ہیں۔ بے گناہی کے جرم میں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا یہ کھیل تا حال جاری ہے۔ کوچہ و بازار میں کبھی بم دھماکے، کبھی خودکش حملے اور کبھی فائرنگ کے واقعات آئے روز پیش آتے ہیں اور قوم کے زخموں میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں اس جنگ میں کس نے جھونکا یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے بہر حال ہم ایسی جنگ لڑنے پہ مجبور ہیں جس میں ہمارے اپنے ہی ہمارے دشمن کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ دوست اور دشمن کی پہچان محو ہو کر رہ گئی ہے۔ البتہ یہ اظہر من الشمس ہے کہ معصوم انسانوں کی جان لینے والے نہ تو دین اسلام کے خیر خواہ ہیں اور نہ ہی وہ ملت اسلامیہ پاکستان کے خیر خواہ ہیں بلکہ وہ تو شاید انسانیت کے دائرے سے ہی خارج ہیں۔ وہ دین اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اپنی اصلیت چھپا نہیں سکتے۔ پشاور میں آرمی پبلک کالج کے طلبہ کے اندوہناک قتل عام کے سانحے نے ان دہشت گرد عناصر کے چہروں سے نقاب ہٹا دیا ہے۔ قوم تذبذب سے نکل کر اس امر

پہ یکسو ہو چکی ہے کہ کچھ بھی ہو اس عفریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ملک کی تمام دینی اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں نے جنگ میں حکومت کے ساتھ تعاون پہ اتفاق کیا ہے اور سیاسی و عسکری قیادت ایک ہی سمت گامزن نظر آتی ہیں۔یہ امر خوش آئند ہے کہ قوم متحد ہے اور ہماری صفوں میں اتفاق ہے۔

جہاں قوم کا اتحاد ہمارے لیے حوصلہ افزا ہے وہاں یہ جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اس عفریت سے جان چھڑانے کے لیے کس حد تک سنجیدہ ہیں۔اس سنجیدگی کا فقدان ہمیں ہر جانب نظر آتا ہے۔ریاست میں قانون کی عملداری کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس ریاست کے پاس بہترین قانون موجود ہو۔ریاستی قانون کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں عدل اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ریاست کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو نشان عبرت بناتا ہے۔مگر مقام افسوس ہے کہ ہم ریاست کو ایسا قانون دینے میں ناکام رہے ہیں جو بلا تفریق انصاف کی فراہمی کو یقینی بنا سکے۔جب ہم نے اعلان جنگ کیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں حالت جنگ کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ایک سانحے کے نتیجے میں ہنگامی قانون سازی کی بھی تو اس طرح کہ دہشت گردوں کو دعوت عام دے دی کہ دین کے نام پر دہشت گردی کروگے تو عبرت کا نشان بنا دیے جاؤگے۔لہٰذا کسی اور نام سے یہ کاروائیاں جاری رکھو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔دہشتگردی سے نمٹنے کے لیے

ہماری پاک فوج قبائلی علاقوں میں کاروائیاں کر رہی ہے تاکہ قانون کی عملداری قائم کی جاسکے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان علاقوں میں تو 1973ء کا آئین نافذ العمل کا نظام تھا جس کی حالیہ شورشوں نے FCR ہی نہیں ہے بلکہ یہاں تو انگریز کا بنایا ہوا اینٹ سے اینٹ بجاکے رکھ دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب دہشت گردوں کا صفایا ہو جائے گا تو یہاں کونسا قانون نافذ العمل ہو گا جس کی عملداری ہو گی۔ ایک ہی ریاست میں دو مختلف قانون ریاست در ریاست نہیں تو اور کیا ہے ؟ضرورت اس امر کی ہے کہ ان علاقوں کے لیے مستقل قانون سازی کی جائے اور انہیں قومی دھارے میں لایا جائے۔ ان علاقوں کو صوبوں کے مساوی حقوق دلائے جائیں لیکن ہمارے ارباب اختیار اس جانب توجہ دینے کے بجائے خواب غفلت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جس خطہ زمیں کے لیے قانون بنایا ہی نہیں گیا اور جو بنایا بھی گیا وہ بھی بقیہ ملک سے ہٹ کر تو پھر وہاں قانوں کی عملداری کا کیا مطلب ؟اب مقنّنہ پہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس ضمن میں مؤثر قانون سازی کرے۔

صوبائی اور وفاقی حکومتوں کی سنجیدگی کا عالم بھی ان کے کردار سے عیاں ہوتا ہے ۔صوبائی حکومتیں واقعات کی ذمہ داری وفاقی حکومت پہ ڈال دیتی ہیں اور وفاقی حکومت صوبائی حکومت پہ نزلہ گرا کر خود کو بری الذمہ قرار دیتی ہیں۔ سیاستدان خصوصا حکمران جب دہشت گردوں سے جنگ کا اعلان کرتے ہیں تو اپنے

گرد سرکاری محافظوں کی فوج ظفر موج میں اضافہ کر دیتے ہیں اور عوام کو دہشت گردوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عوام اور خواص کے مابین یہ امتیاز اس اہم معاملے میں حکمرانوں کی غیر سنجیدگی کا بیّن ثبوت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کے مختلف ادارے محض تنخواہیں بٹورنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں عملی طور پہ ان کی کارکردگی کہیں نظر نہیں آتی۔ دہشت گردی کے نتیجے میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا صوبہ خیبر پختونخواہ ہے اور اس کی سرحدات قبائلی علاقوں سے بھی ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے خیبر پختونخواہ کی حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ عوام کی جان و مال کا تحفظ یقینی بنائے لیکن حکومت احتجاجی دھرنوں اور سڑکوں پہ رقص و سرور سے فارغ ہو تو اس جانب توجہ دے۔ حکمرانوں کے پروٹوکول کے کاروان متاثرہ خاندانوں سے ہمدردی کے بجائے ان کے منہ پہ تھپڑ مارنے کے مترادف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سانحات محض حکمرانوں کی تشہیری مہم کے لیے رونما ہوتے ہیں۔ عوام خون کے آنسو پی کر رہ جاتے ہیں اور سیاسی ٹولہ فوٹو سیشن کے ذریعے اپنا قد کاٹھ بڑھانے میں مگن ہو جاتا ہے۔ ان بلٹ پروف گاڑیوں اور حفاظتی حصار کی وجہ سے عوامی جذبات بھی حکمرانوں کے دلوں تک نہیں پہنچ پاتے۔

اب حکومتوں کی سنجیدگی کا عالم ملاحظہ کیجیے کہ اہم امور پہ ان کی غفلت کا کیا عالم ہے۔ دہشتگردی کے لیے سب سے اہم مواد اسلحہ ہے اسی اسلحے کے زور پہ

معصوم انسانوں کی جان لی جاتی ہے اور خوف و ہراس پھیلایا جاتا ہے۔ یہ اسلحہ اور گولہ بارود اِن دہشتگردوں تک کہاں سے پہنچتا ہے یہ معلوم کرنا ہمارے سیکیورٹی اداروں کا کام ہے اور وہ اپنا کام کس حد تک انجام دے رہے ہیں یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ جو لوگ پشاور سے کوہاٹ کا سفر کر چکے ہوں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ راستے میں درہ آدم خیل کا قبائلی علاقہ ہے جو اسلحے کی بڑی منڈی ہے۔ یہاں اسلحہ سازی کے کارخانے لگے ہیں اور ایک بڑی اکثریت کا روزگار اسی صنعت سے وابستہ ہے۔ درہ بازار میں ہر نوع کا اسلحہ دستیاب ہے۔ یہاں کلاشنکوف، ریوالور، بندوقیں، راکٹ لانچر، بارودی سرنگیں اور طیارہ شکن گنیں بھی بنتی ہیں۔ یہ اسلحہ تو فوجی نوعیت کا ہے اس کا عام آدمی سے کیا تعلق ؟ یہ اسلحہ کون خریدتا ہے ؟ یہ اسلحہ کہاں لے جایا جاتا ہے ؟ اسلحے کی اس فراوانی اور ترسیل کو روکنے کے لیے مرکزی اور صوبائی حکومتیں کیا کردار ادا کر رہی ہیں ؟ حکومتیں اس سارے معاملے سے نظریں چرا کر بیٹھی ہوئی ہیں اور عوام کے چیتھڑے اڑائے جا رہے ہیں۔ پشاور میں کارخانو مارکیٹ ہے جہاں اربوں روپے مالیت کا سمگل شدہ مال بکتا ہے۔ ٹیکس ادا نہ کرنے کی وجہ سے یہ ارزاں ہے اور پورے ملک سے لوگ یہ مال خریدنے پشاور آتے ہیں۔ یہ مال گاڑیوں میں سمگل ہو کر دیگر علاقوں میں جاتا ہے راستے میں چیکنگ ہوتی ہے مگر مٹھی گرم کر دی جاتی ہے اور مال سمگل ہو جاتا ہے۔ اس مال کی آڑ میں کیا کیا سمگل ہو رہا ہے اس کی اطلاع کیونکر 1717 کو دی جائے ؟ اگر مشکوک سرگرمی دیکھیں تو

حکومتی اداروں کو بتایں لیکن حکومتی ادارے اگر ایک یقین جرم پہ چشم پوشی کا مظاہرہ کریں تو عوام کیا کریں ؟اسی طرح ملاکنڈ ڈویژن میں کسٹم چور گاڑیاں دستیاب ہیں جن پہ مقامی انتظامیہ کی نمبر پلیٹ لگا کر ڈویژن کی حد تک قانونی بنادیا جاتا ہے۔ یہ گاڑیاں سستی ہونے کی وجہ سے عام افراد کی قوت خرید میں ہیں۔ اب اگر دہشتگرد یہ گاڑیاں استعمال کریں تو یہ معلوم بھی نہیں کیا جاسکے گا کہ کس کی گاڑی استعمال ہوئی کیونکہ وہ گاڑی رجسٹر ہی نہیں ہوئی۔اسمگلنگ کا تدارک کرنا حکومتوں کا فرض ہے لیکن اس ضمن میں وہی خواب غفلت ۔اب آپ ہنڈی کے کاروبار کو ہی دیکھ لیں یہ قطعاً غیر قانونی ہے مگر صوبے اور ملک کے ہر حصے میں جاری ہے۔ اس کے ذریعے نقد رقم کی منتقلی ہوتی ہے اور حکومتی ادارے کے پاس رجسٹر نہ ہونے کی وجہ سے اس رقم کا سراغ لگانا ممکن نہیں رہتا کہ کس نے کسے رقم فراہم کی ۔ اب دیکھیے دہشتگردی کے لیے مالی معاونت کا راستہ کھلا ہے، اسلحے کی تجارت کے لیے راہ ہموار ہے اور اسکی ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہیں تو پھر یہ حکومتیں کس چیز کے خلاف لڑ رہی ہیں اور کس کا تدارک کر رہی ہیں ۔

گزشتہ کچھ عرصے سے عدلیہ عوامی توقعات کا مرکز بنی ہوئی ہے لیکن دہشت گردی کے معاملے میں عدالتوں کی کارکردگی مایوس کن رہی ہے ۔ فوجی عدالتوں کا قیام عدالتی نظام کی ناکامی کا یقین ثبوت ہے۔انصاف کی فراہمی کے لیے عدلیہ نے

دہرا معیار اپنا رکھا ہے۔ ہمارے ملک کی ایک نامور شخصیت پہ ایک سے زائد مقدمات ہیں جن میں اسے سزائے موت بھی ہو سکتی ہے لیکن انہیں گرفتار تک نہیں کیا گیا بلکہ وہ شخص سرکاری پہرے میں پورے ملک میں دندناتا پھرتا ہے جبکہ اسی شخص پہ قاتلانہ حملہ کرنے والوں کو سزائے موت دی جا چکی ہے۔ مقتول ابھی زندہ ہے جبکہ قاتل تختۂ دار پہ جھول گئے۔ یہ کیسا نظام عدل ہے ؟اگر معاشرے میں عدل کی فراہمی کو یقینی نہ بنایا گیا تو قوم تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گی۔ عدلیہ کو اپنی کارکردگی بہتر بنانا ہوگی تبھی ہم اس جنگ میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

دہشتگردی کے خاتمے کے لیے عوام نے متفقہ طور پہ حکومت وقت کو ذمہ داری سونپ دی ہے اب یہ حکومت کا فرض ہے کہ اپنے شہریوں کے تحفظ کے لیے انتہائی اقدام کر گزرے۔ اسکے لیے لازم ہے کہ حکومت ، مقننہ ، انتظامیہ اور عدلیہ کا قبلہ درست ہو ۔دہشت گردی کے خلاف جامع حکمت عملی تیار کرنے کی ضرورت اشد ہے جس کے ذریعے دہشتگردوں کی ہر قسم کی سرگرمی کو روکا جاسکے ۔ایسے قوانین مرتب کیے جائیں جن کی موجودگی میں ہنگامی قانون سازی نہ کرنا پڑے۔ حکومت کو بلا تفریق کاروائی کرنا چاہیے اور ہر قسم کی دہشت گردی کا سدباب ہونا چاہیے۔ کسی کو بھی قانون سے ماوراء نہیں ہونا چاہیے۔ کسی بھی شخص یا ادارے کو قانون سے ماوراء نہیں ہونا چاہیے ۔اگر ہم بلا تفریق انصاف کی فراہمی کو یقینی بنادیں

اور ہر مجرم کو قرار واقعی سزا دیں تو مسئلے پہ قابو پایا جا سکتا ہے۔ اسکے ساتھ عوام کو دینی و دنیوی تعلیم سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ خالی ذہن ہی دہشتگردوں کے شکنجے میں باآسانی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ دہشتگردوں کی فکر سے لڑنے کے لیے تطہیر افکار کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں علماء اور دینی جماعتوں سے تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ اگر آج بھی ہم نے سانحات سے سبق نہ سیکھا اور اپنا قبلہ درست نہ کیا تو ہماری داستاں تک نہ ہو گی داستانوں میں۔

بدلتی عالمی صورتحال میں یکجہتی کشمیر کے تقاضے

۵ فروری کا دن جب بھی آتا ہے دل و دماغ ماضی کے جھروکوں میں لوٹ جاتا ہے ۔جب ۱۹۹۰ میں پہلی بار یوم یکجہتی کشمیر منایا گیا تھا، تمام ملک میں عام تعطیل تھی، تمام سرکاری و نجی اداروں اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنے کاروبار زندگی بند کرکے کشمیریوں سے یکجہتی کا اظہار کیا۔ٹی وی، ریڈیو، اخبارات اور رسائل نے کشمیری عوام سے یکجہتی کے حوالے سے خصوصی کردار ادا کیا۔ وطن عزیز کے کوچہ و بازار میں ہر مرد وزن، طفل و ناتواں کی زبان پہ کشمیر کی آزادی کا تذکرہ تھا۔ کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل پہ بات چیت ہو رہی تھی۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ پاکستانی قوم نے کشمیر کی آزادی کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے۔ دوسری جانب کشمیر کے کوچہ و بازار تھے جہاں ۱۹۸۹ میں تحریک حریت کشمیر نے عسکریت کی راہ اختیار کر لی تھی۔ کشمیری قوم قلم چھوڑ کر کلاشنکوف اٹھا چکی تھی اب ان کے آزادی کے نعروں میں گولیوں کی تڑتراہٹ کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ وہی کشمیری قوم تھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ بندوق کو دھوپ میں رکھ کر کہتے ہیں "تپ سی تے ٹھس کر سی" اب وہی کشمیری بندوق لیے دنیا کی ایک بڑی فوج کے غاصبانہ قبضے کے خلاف سینہ سپر ہو گئی تھی اور اسے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ کشمیری عوام نے خود کو پاکستان سے جوڑ لیا تھا ہر عمارت

پہ پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا، نوجوان جوق در جوق مجاہدین کے قافلوں میں شامل ہو رہے تھے ، شہداء کے جنازے روز کا معمول بن گئے تھے اور ہر گلی ہر کوچہ سے صدا بلند ہو رہی تھی ۔۔۔۔ہم پاکستانی ہیں ۔۔۔۔ پاکستان ہمارا ہے۔۔۔ جیوے جیوے پاکستان ۔۔۔ پاکستان سے رشتہ کیا۔۔۔۔ لاالہ الااللہ۔ گویا دونوں جانب ہم آہنگی اور یکجہتی کی فضاء نظر آتی تھی ۔

یہ یکجہتی کی فضاء کوئی وقتی جوش نہ تھا بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت کا نام ہے ۔ کشمیری قوم اور پاکستانی عوام میں ایک فطری یکجہتی اور قلبی وابستگی ہے۔ کشمیر اور پاکستان کا رشتہ ہمالیہ سے بلند اور بحر ہند سے گہرا ہے ۔ کشمیر کی چوٹیوں پہ پڑنے والی بارش اور اوس کے قطرے بھی راستہ بناتے ہیں تو پاکستان کا رخ کرتے ہیں اور پاکستان کے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں ۔ تو دوسری جانب بحیرہ عرب کے ساحلوں پہ چلنے والی نمی سے بھرپور ہوا بھی بارش کا ثمر دینے کے لیے کشمیر کے پہاڑوں کا رخ کرتی ہے ۔ کشمیر کو جانے والے آمد و رفت کے تمام راستے پاکستان سے جاتے ہیں۔ کشمیر کی سرحدات پاکستان سے ملتی ہیں ۔ کشمیری عوام کی اکثریت مسلمان ہے اور پاکستان مدینہ منورہ کے بعد دنیا کی واحد ریاست ہے جو اسلام کے نام پہ حاصل کی گئی ۔ ملت اسلامیہ کشمیر اور پاکستان کے بیچ اسلام ہی سب سے اہم اور مضبوط رشتہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا۔ اس

فطری یکجہتی کا عملی مظاہرہ اسوقت ہوا جب ۱۹۴۷ میں کشمیری عوام نے ڈوگرہ فوج کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کیا تو ان کی مدد کے لیے پاکستان کے قبائلی لشکر اور پنجاب کے سکاؤٹس نے جانی و مالی امداد کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ میں کشمیری عوام نے خون کا نذرانہ پیش کیا صرف اس لئے کہ وہ پاکستان سے ۱۹۴۷ الحاق کے خوگر تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ کو جموں میں لاکھوں افراد کو صرف اس لیے تہہ تیغ کیا گیا کہ وہ پاکستان سے قلبی وابستگی رکھتے تھے۔ اسکے بعد متعدد بار پاکستان اور بھارت میدان جنگ میں آمنے سامنے ہوئے اور ہزاروں پاکستانیوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے خون کے نذرانے پیش کیے۔ کشمیری عوام نے بھارت کے غیر قانونی تسلط کو کبھی تسلیم نہیں کیا انہوں نے سیاسی جدوجہد کے ذریعے عالمی ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کی لیکن ان کی آواز نہ سنی گئی تو انہوں نے بندوق کی راہ اپنا لی۔ جب کشمیری مجاہدین نے بندوق کی راہ اپنائی تو پاکستانی قوم ان کی پشت پہ کھڑی ہو گئی۔ یہی یکجہتی تھی جس کے اظہار کے لیے ۵ فروری کو یوم یکجہتی کشمیر منایا گیا۔ اور دنیا کو بتایا گیا کہ کشمیری اس جنگ میں تنہا نہیں ہیں بلکہ پاکستانی قوم ان کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اس جذبے نے ہندوستانی فرعونوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے یہ تک کہ دیا تھا کہ "کشمیر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا"۔

پاکستان کی سفارتی اور اخلاقی حمایت کے سائے میں کشمیری مجاہدین سیسہ پلائی دیوار بن کر ہندوستانی قبضے کے خلاف صف آرا ہوئے تو بھارت نے کشمیر کو مسئلہ جانا اور مذاکرات کی میز تک آگیا۔ ۹۰ کی دہائی میں تحریک آزادی کشمیر عروج تک پہنچ گئی ۔کشمیری قوم نے آزادی کے حصول کے لیے لازوال قربانیاں پیش کیں ۔ ۸۰ ہزار سے زائد کشمیریوں نے جان کا نذرانہ پیش کیا، لاکھوں بے گھر ہوئے اور ہزاروں خواتین کی عصمت دری کی گئی ۔ان سب قربانیوں کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ منطقی انجام کو پہنچ جائے گی لیکن اس تحریک میں ایک موڑ آیا جس نے اس تحریک کو منزل سے دور کر دیا۔پاکستان میں ایک مطلق العنان حکمران طاقت کے زور پہ بر سر اقتدار آگیا۔ابتداء میں پاکستانی اور کشمیری عوام نے یہ سمجھا کہ فوج کی وردی میں ملبوس یہ حکمران مرد آہن ثابت ہو گا لیکن ان کی امیدوں پہ اس وقت پانی پھر گیا جب انہوں نے اسے ایک ہی فون کال پہ گھٹنے ٹیکتے دیکھا۔ جسے وہ چٹان سمجھے تھے وہ ایک فون کال کی تاب بھی نہ لا سکا اور ڈھیر ہوگیا۔ اس نے قوم کو "سب سے پہلے پاکستان " کے نعرے کے ذریعے فریب دیا اور امت مسلمہ سے پاکستان کا تعلق کاٹنے کی کوشش کی ۔ تحریک آزادی کشمیر بھی اس نعرے کا شکار ہوئی اور ملی یکجہتی کو شدید دھچکا لگا۔ کشمیر جو پاکستان کی خارجہ پالیسی کا اہم ترین جزء تھا وہ ترجیح اول نہ رہا۔ ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا اور دو طرفہ تجارت کے راگ الاپے جانے لگے۔ یہاں تک کہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی کنٹرول لائن پہ باڑ

لگا کر کشمیر کو تقسیم کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ اس صورتحال نے کشمیری عوام کو مایوس کیا۔ کشمیری عوام کی کثیر تعداد عسکری جدوجہد ترک کر کے سیاسی جدوجہد کرنے کی طرف راغب ہو گئی۔ اس رجحان کی وجہ سے کشمیر کی مسلح جدوجہد مدہم پڑ گئی۔

سب سے پہلے پاکستان "کی سوچ نے پاکستان کو تنہا کر دیا۔ پاکستان کی امت کے" معاملات کے ساتھ یکجہتی معدوم ہوتی گئی۔ بھارت نے اس صورتحال سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اپنی کامیاب خارجہ پالیسی کے ذریعے بھارت نے امریکہ سمیت عالمی برادری کو یہ باور کرا دیا کہ کشمیر میں جاری عسکری تحریک پاکستان کی جانب سے دراندازی ہے اور یہ بھی اس دہشت گردی کا حصہ ہے جس کے خلاف افغانستان اور عراق میں لڑا جا رہا ہے۔ پاکستان دہشت گردی کی جنگ میں ناٹو کا صف اول کا اتحادی تھا اس صورتحال کا فائدہ بھی پاکستان کو ہی اٹھانا چاہیے تھا اور موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عالمی برادری کو اس تعاون کے بدلے کشمیر کے مسئلے کو حل کروانا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس ہوا۔ عالمی رائے عامہ بھارت کی ہمنوا ہو گئی اور پاکستان کو تحریک آزادیٔ کشمیر سے دست کشی اختیار کرنا پڑی۔ اس محاذ پہ پاکستان کی پسپائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے کشمیر کی جانب سے پاکستان آنے والے دریاؤں پہ آبی جارحیت کا آغاز کر دیا۔ پاکستان کی زراعت آبی قلت کا شکار ہوئی اور ملک اندھیروں میں

ڈوب چکا۔ جس امریکہ کی خاطر پاکستان نے کشمیریوں سے یکجہتی سے دست کشی اختیار کی وہ بھی بھارت کا ہمنوا ہو گیا۔ امریکی صدر اوبامہ کا حالیہ دورۂ بھارت، امریکہ بھارت سول نیوکلئیر تعاون، اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھارت کو مستقل رکنیت دینے پر آمادگی اس کا بین ثبوت ہیں۔ موسم کی طرح تبدیل ہوتی عالمی صورتحال میں جہاں تحریک آزادیٔ کشمیر کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے وہیں امید کی کرن بھی پیامِ سحر دیتی ہیں۔

بدلتی رتوں میں امریکہ کا بھارت سے یارانہ چین کو سیاسی اور اقتصادی طور پہ محدود کرنے کا منصوبہ ہے۔ پاکستان کو اس صورتحال کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چین سے پاکستان کے دیرینہ مراسم ہیں۔ اس صورتحال میں چین کا بھرپور ساتھ دینا چاہیے اور بدلے میں چین کا تعاون مسئلۂ کشمیر کے حل کے لیے حاصل کرنا چاہیے۔ اگر چینی حکومت بھی تحریک آزادی کشمیر کی بھرپور حمایت کرے تو یہ یکجہتی ثمر آور ثابت ہو سکتی ہے۔ بھارت کو مستقل رکنیت کے حصول کے لیے مسئلہ کشمیر کو حل کرنا پڑے گا۔ اس ضمن میں روس سے بھی روابط بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ شاید کہ ان کی امریکہ دشمنی کی رگ بیدار ہو کر ہمارے کام آسکے۔ اگر ان دو ممالک نے تحریک آزادی کی حمایت کی تو منزل آسان ہو جائے گی۔ چین اور روس کے علاوہ بھی ہمسایہ ممالک ہیں جو بھارت کی چودھراہٹ سے خائف ہیں۔ ان ممالک کی طرف بھی دست تعاون بڑھانے کی ضرورت ہے۔ خطے میں امن و امان کی صورتحال برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے علاقائی

مسائل حل ہوں۔ اگر ان ممالک کی طرف سے کشمیریوں کی تحریک آزادی کے ساتھ یکجہتی کا اظہار ہو جائے تو عالمی ضمیر بیدار ہو سکتا ہے اور کشمیر کی آزادی کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

مسئلۂ کشمیر کے حل کے لیے سب سے اہم کردار اگر کوئی ادا کر سکتا ہے تو وہ امت مسلمہ ہے۔ امت مسلمہ ایک خوابیدہ شیر ہے جو دنیا کے اہم وسائل سے لبریز ہے۔ اگر ان وسائل پہ اپنی گرفت مضبوط کی جائے تو دنیا کی رائے کو اپنی مٹھی میں کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں اس بات کو اہمیت دینا چاہیے کہ وہ امت کے مسائل کو حل کرے اور اتحاد بین المسلمین کی راہ ہموار کرے۔ کشمیر امت مسلمہ کا حل طلب مسئلہ ہے۔ دنیا میں اس وقت ۵۵ مسلم ممالک ہیں۔ یہ بہت بڑی تعداد ہے جو بیک زبان ہو کر بولیں تو بہروں کو بھی سنائی دے۔ اگر تمام مسلم ممالک اس مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھیں اور کشمیریوں کے ساتھ یکجہتی کا عملی مظاہرہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مسئلہ حل طلب رہے کو مضبوط اور فعال بنائیں اور ایک دوسرے کے مسائل OIC۔ مسلم ممالک کو چاہیے کہ کو از خود حل کریں۔ اگر مسلم ممالک ایکا کر لیں اور دنیا کی بڑی طاقتوں کو آمادہ کریں کہ مستقل رکنیت کسی مسلم ملک کو دی جائے تو اس دباؤ کا خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ کی دہائی میں چند امور نے تحریک آزادی کشمیر کو نقصان پہنچایا ہے اگر ان ۹۰

غلطیوں سے بچا جائے تو نقصان سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ جا بجا پاکستانی اور غیر ریاستی تنظیموں کے قیام سے اجتناب کیا جائے۔ اس طرح کی تنظیموں پہ ہندوستان کو انگلی اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ سیاسی اور عسکری میدان میں کشمیر کی علاقائی تنظیموں پہ ہی تکیہ کیا جائے۔ اسی طرح کشمیری قیادت کی باہم چپقلش بھی تحریک کے مستقبل کو دھندلا دیتی ہے۔ کشمیری عوام اور کشمیری قیادت کو اپنے نظریاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کشمیر کی آزادی کے لیے سیاسی و عسکری میدان میں جدوجہد کرنا ہو گی۔ اگر ان امور کا خیال رکھتے ہوئے قدم سے قدم ملا کر چلا جائے اور کشمیری عوام کے ساتھ دلی یکجہتی کا مظاہرہ کیا جائے تو وہ وقت دور نہیں جب سرزمین کشمیر میں آزادی کا سورج طلوع ہو۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ترنم آفریں ہوگی بادِ بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اٹھتے ہیں حجاب آخر۔۔۔۔۔

وطن عزیز پاکستان کی پاکیزہ فضائیں گزشتہ ایک دہائی سے دہشتگردی کے ہاتھوں خاک وخون سے مکدر ہیں۔آئے روز دہشت گردی کے واقعات قوم کو جانی و مالی نقصان سے ہمکنار کرتے ہیں۔کچھ نادیدہ قوتیں پاکستان کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے در پہ ہیں اوراپنے عزائم کی تکمیل کے لیے وہ اس قسم کی کاروائیاں کر رہی ہیں۔ان نادیدہ قوتوں کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں اسی مٹی سے ننگ دین ننگ وطن لوگ مل جاتے ہیں جو ان کے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے اپنے ہی وطن کے کوچہ و بازار کو اپنے ہی بھائیوں کے خون سے رنگ دیتے ہیں۔ان نادیدہ قوتون کو بے نقاب کرنا اور ان کو عبرت کانشان بنانا ہمارے ارباب اختیار کی ذمہ داری ہے۔پے در پے دہشت گردی کے واقعات کے نتیجے میں ایوان حکومت کے در و دیوار ہل جانا چاہیے تھے اور حکمرانوں کو خواب غفلت سے بیدار ہو جانا چاہیے تھا مگر صد افسوس کہ مقتدر طبقہ ابھی تک اس مرض سے گلوخلاصی کے لیے سنجیدہ نظر نہیں آتا۔

۱۶ دسمبر کے سانحۂ پشاور نے جہاں قوم کو شدید صدمے سے دوچار کیا وہاں قومی یکجہتی نے امید کی ایک اور کرن بھی پیدا کر دی۔اس واقعے کی شدت و حدت

نے اہل قلب و نظر کو اس مرض کہن سے نبرد آزما ہونے کے لیے آمادہ و تیار کیا۔ ہر سیاسی و مذہبی جماعت نے اپنے نظریات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دہشت گردی کے خلاف حکومت سے اپنے تعاون کا اعادہ کیا اور دہشتگردی کے خاتمے کے لیے آخری حدوں تک جانے کا عزم کیا۔ سدا جمہوریت کا راگ الاپنے والوں کو بھی فوجی عدالتوں کے قیام کا کڑوا گھونٹ حلق سے اتارنا پڑا۔ اس سانحے کے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب محلوں کے مکیں بھی جاگے ہیں اب اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل نکلے گا مگر افسوس کہ عملی طور پہ ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ قوم کے ہر طبقے اور ہر سیاسی گروہ نے اس مسئلے سے نجات کے لیے دست تعاون دراز کیا۔ اس میں دینی جماعتوں، سیاسی جماعتوں، فوج اور نجی تنظیمات نے اپنے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ طے یہ ہوا کہ دہشتگردون سے آہنی ہاتھوں کے ساتھ نمٹا جائے۔ اور کوئی بھی رعایت نہ دی جائے۔ لیکن جب قانون سازی کا مرحلہ آیا تو لبرل طبقے کی طرف سے دوہرے معیار کا ایک عظیم الشان مظاہرہ سامنے آیا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر سیکولر جماعتوں نے دہشت گردی کو مذہبی طبقے سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اکسویں ترمیم کے ذریعے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے دہشتگردون کے خلاف اختیارارت میں اضافہ کیا گیا ہے اور دہشت گردی کے مقدمات کو فوجی عدالتوں میں چلانے کا فیصلہ ہوا لیکن ساتھ ہی دہشتگردی کے ساتھ لفظ مذہبی کا سابقہ لگا کر عجیب تفریق پیدا کر دی گئی۔ اب وطن عزیز کی سرزمین پہ اگر کوئی شخص مذہبی لبادے میں انسانی جانوں سے کھیلے

گا تو زیر عتاب آئے گا اور اگر وہی عمل سیکولرازم، علاقائیت، لسانیت یا کسی بھی غیر مذہبی چھتری کے تحت کرے گا تو اسے استثناء حاصل ہو گا۔ یعنی مذہب کا نام استعمال کیے بغیر ہر قسم کے رقص ابلیس کی اجازت ہے۔

اہل سیاست کا یہ دوہرا معیار سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ وہی بائیں بازو کی لبرل جماعتیں ہیں جو طالبان سے مزاکرات کے لیے آمادہ نہیں تھیں اور نہ ہی ان کے لیے کسی بھی قسم کا نرم گوشہ قبول کرتی تھیں لیکن دوسری جانب یہی جماعتیں بلوچستان میں پاکستان کی ریاست کے خلاف برسرپیکار بلوچ باغیوں سے مذاکرات کی حامی ہیں۔ اسی طرح دیہی سندھ میں ڈاکو راج ہے اور شہری سندھ بھی دہشت گردی کی شدید لپیٹ میں ہے۔ لیکن یہ لبرل جماعتیں وہاں پہ فوجی آپریشن کا مطالبہ نہیں کرتیں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ قبائلی علاقوں میں جاری شورش کے لیے فوجی کاروائی کو ہی حل تصور کیا جاتا ہے تو بلوچستان، سندھ اور کراچی میں دہشتگردی سے مقابلہ کرنے کے لیے نہتے عوام کو تنہا کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ طالبان کی عسکریت پسندی نے مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا ہے جبکہ دیگر شورشیں غیر مذہبی رنگ رکھتی ہیں۔ حالانکہ دونوں ہی دہشتگردی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اکیسویں ترمیم کے منظور ہونے کے بعد تو ایسا لگتا ہے جیسے اسکا اصل مقصد ہی لبرل دہشت گردوں کو قانونی آڑ فراہم کرنا ہے۔

کراچی میں امن و امان قائم کرنے کے لیے سپریم کورٹ نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی تحقیقاتی رپورٹ کے نتیجے میں حکومت کو ہدایات جاری کیں جس میں چند تنظیموں کو نامزد کرکے کہا گیا ہے کہ ان کے عسکری شعبہ جات ہیں جو دہشتگردی میں ملوث ہیں لہٰذا ان تنظیموں کے خلاف کاروائی کیجائے ۔ یہ سب لبرل سیاسی جماعتیں تھیں جن میں سر فہرست ایم کیو ایم تھی۔ حکومت نے ان کے خلاف آپریشن میں لیت و لعل سے کام لیا۔ اکیسویں ترمیم کے بعد ان تنظیموں کو دہشت گردی کرنے کا گویا لائسنس مل گیا ہے۔

سانحۂ پشاور میں 150 انسانی جانیں لقمۂ اجل بنیں تو ان سیاسی جماعتوں نے کہرام مچایا اور مذہبی جماعتوں اور دینی اداروں کا گھیراؤ کرنے کی تجاویز حکومت کو پیش کر دیں۔ایم کیو ایم نے تو جماعت اسلامی پر پابندی جیسے مطالبات بھی پیش کیے۔ کچھ اداروں نے تو اپنی کارکردی دکھانے کے لیے کچھ کتابوں کو بھی شدت پسندی سے منسلک کرکے ان کے بیچنے والوں کے خلاف کاروائی کر ڈالی ۔ ان کتب میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی تصانیف بھی شامل ہیں ۔دوسری جانب جب کراچی میں ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے جب بھی کسی مجرم پہ ہاتھ ڈالتے ہیں تو یہی امن کی دعویدار ایم کیو ایم شور مچا دیتی ہے کہ اس کے کارکنوں کے خلاف کاروائی کیجارہی ہے ۔ کوئی حکومتی ادارہ ان سے یہ تو

پوچھے کہ آپ کے کارکن جرائم میں ملوث کیوں ہیں۔ دو برس قبل کراچی بلدیہ ٹاؤن کی ایک فیکٹری میں آتشزدگی سے 257 افراد جل کر لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ تمام قوم نے اس سانحے کو حادثہ سمجھا تھا اور ذمہ داران کے تعین کی بحث بھی ہوئی۔ فیکٹری کے مالکان، ملازمین، اور کچھ سرکاری ملازمین کو عدالتی کاروائی بھی بھگتنا پڑی لیکن اب یہ حقیقت آشکارا ہوئی ہے کہ یہ محض حادثہ نہیں تھا بلکہ 257 افراد کا بہیمانہ قتل تھا۔ قاتل گرفتار ہے اور خود بیان دے چکا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی تفتیش کے بعد آنے والی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ملزم کا تعلق ایم کیو ایم سے ہے۔ اور یہ گھناؤنا جرم صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ اس فیکٹری مالک نے بھتہ ادا نہیں کیا تھا۔ یہ انسانی جانوں کے ضیاع کے لحاظ سے سانحۂ پشاور سے بھی بڑا واقعہ تھا۔ ایک ہی رپورٹ ایم کیو ایم کو دو جرائم بھتہ اور دہشتگردی کا مرتکب قرار دے رہی ہے۔ لیکن ایک جانب تو حکومت خاموش ہے تو دوسری جانب سیکولر طبقے نے ایسے چپ سادھ لی جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

وقت نے بہت جلد چہروں سے خوشنما حجاب اٹھا دیے ہیں اور ان سیکولر اور لبرل جماعتوں کا اصل چہرہ آشکار ہو گیا ہے۔ لیکن دوسری جانب حکومت خاموش تماشائی بنی بے بسی کا اظہار کر رہی ہے۔ ایک طرف تو ان سیاسی جماعتوں کے ایما پر مداس دینیہ کے خلاف کاروائی کرنے کی منظوری دی گئی ہے تو دوسری جانب ان

دہشتگرد تنظیموں کی قیادت کے نام پر یونیورسٹیاں قائم کی جارہی ہیں۔ قوم یہ پوچھنے کا استحقاق تو رکھتی ہے کہ ان یونیورسٹیوں میں کس چیز کی تعلیم دی جائے گی۔اب حکومت کے کاندھوں پہ بھاری ذمہ داری ہے کہ حقیقت آشکار ہونے کے بعد ان دہشت گرد تنظیموں کے خلاف بلا تفریق کاروائی کی جائے۔ یہ حکومت وقت کے لیے کڑا امتحان ہے کہ وہ ان عناصر سے مقابلہ کرے اور ملک کو دہشتگردی کے ناسور سے نجات دلائے۔ ہم تو دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالی ہمارے پیارے دیس کی نیا کو دہشتگردی کے منجھدار سے نکال کر امن کے ساحل پہ لگا دے۔آمین۔

جیل ٹوٹ گئی۔۔۔۔۔۔

(شہید کشمیر مقبول بٹؒ کی زندگی کے گوشے وا کرتی تحریر)

"جج صاحب ابھی وہ رسی نہیں بنی جس سے مقبول بٹ کو پھانسی دی جاسکے" ابھی جج نے فیصلہ سنایا ہی تھا کہ ملزم نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔اس نے نڈر پن میں جج کو یہ بھی کہہ دیا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے گلے میں پھندا ڈال دینے سے تم کامیاب ہو جاؤگے تو یہ تمہاری بھول ہے میرا مشن تو اس وقت شروع ہو گا جب مجھے پھانسی پہ لٹکا دیا جائے گا۔یہ الفاظ مقبوضہ ریاست جموں و کشمیر کے اس دلیر سپوت کے ہیں جسے قابض بھارتی انتظامیہ نے مجرم قرار دے کر تختۂ دار پہ لٹکا دیا تھا مگر کشمیری قوم اسے اپنا لیڈر اور بطل جلیل مانتی ہے۔

مقبول بٹ نے 18فروری 1938ء کو اس وقت آنکھ کھولی جب جنت نظیر وادئ کشمیر ڈوگرہ خاندان کی جیل بنی ہوئی تھی۔انگریز سامراج نے کشمیر کی پوری ریاست بمع کشمیری عوام کو صرف ۷۵ لاکھ نانک شاہی کے عوض اپنے وفادار وزر خرید ڈوگرہ خاندان کو فروخت کر دیا تھا۔ یہ عنایت ڈوگرہ خاندان پہ دھرتی سے

غداری کرنے کے صلے میں کی گئی۔اس خاندان نے وادی کے چپے چپے میں ظلم و بربریت و سفاکی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مقبول بٹ کی پیدائش کے وقت تک علامہ اقبال کی صدائے حریت کو عبد القدیر کی تقریر اور بعد ازاں ۲۲ افراد کی تکمیل اذان کے لیے شہادت کے واقعے نے مہمیز دے دی تھی اور کشمیری عوام تحریک آزادی کا ہراول دستہ بن گئے تھے۔ 1947 کو پاکستان آزاد ہوا تو کشمیر کے ایک حصے کی آبادی نے جیل توڑ ڈالی اور آزادی کا پھریرا لہرا دیا۔ جبکہ ایک بڑے حصے کو یہ نعمت میسر نہ آ سکی اور وہاں جیل انتظامیہ ڈوگرہ راج سے بھارتی حکومت کو منتقل ہو گئی۔اس جیل میں قید عوام کو اقوام عالم نے دلاسا جو دیا تھا کہ رائے شماری کے ذریعے ان کی مرضی جانی جائے گی اور انہی کی مرضی کے مطابق ان کی تقدیر لکھی جائے گی مگر افسوس کہ یہ وعدہ بھی ایفاء نہ ہوا۔

دور طالب علمی میں مقبول بٹ نے سیاست میں قدم رکھ دیا تھا وہ جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے تحریک آزادی کا متحرک کارکن بن گیا۔ اسی دوران اس نے سینٹ کر لیا۔ اسی کشمکش میں وہ اس جیل سے ہجرت کرکے BA جوزف کالج بارہ مولہ سے آزاد کشمیر آن پہنچا۔ یہاں اس نے پشاور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنے کے لیے صحافت کے پیشے کو اپنالیا اور یہیں اس نے شادی بھی کر لی۔ کشمیر سے ہجرت کرکے آنے کے باوجود اس کا دل کشمیر ہی کے لیے تڑپتا رہا۔ اس نے تحریک آزادی سے وابستگی برقرار

رکھی ۔ساٹھ کی دہائی میں مقبول بٹ نے کچھ ہم خیال افراد سے مل کر ایک تنظیم نیشنل کے نام سے قائم کی (جو بعد میں جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ میں NLF لبریشن فرنٹ تبدیل ہو گئی) اور مقبوضہ وادی کے اندر بھارتی تسلط کے خلاف مسلح کاروائیاں کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔اسکے لیے اس نے ساتھیوں سمیت مقبوضہ وادی میں جاکر تنظیم سازی کا فیصلہ کیا۔ منصوبے کے تحت مقبول بٹ نے1966 میں اپنے ساتھیوں امان اللہ خان ، اورنگزیب ، کالے خان اور میر احمد سمیت کنٹرول لائن کو روند ڈالااور مقبوضہ کشمیر میں تنظیم سازی شروع کر دی ۔ان دیوانوں نے لوہے پہ ضرب تو لگا دی مگر وہ ابھی اتنا گرم نہیں تھا کہ ان کی مرضی کے مطابق مڑ پاتا بس ایک شور مچ گیا۔ مقبول بٹ اور اس کے ساتھیوں کی خفیہ کاروائیوں کا شور وادی میں سنائی دینے لگا۔ مقبول بٹ نے ساتھیوں سمیت تھانے پہ حملہ کیا اور امر چند نامی اہلکار کو ہلاک کر دیااس معرکے میں اس کا قریبی ساتھی اورنگزیب بھی جام شہادت نوش کر گیا۔ بھارتی ایجنسیوں نے ان چھاپہ ماروں کا سراغ لگا لیا۔ ان کے گروہ کے خلاف غیر قانوی طور پہ کنٹرول لائن عبور کرنے اور ریاست کے خلاف باغیانہ کاروائیوں کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ مقبول بٹ نے صرف کنٹرول لائن عبور کرنے کے جرم کو تسلیم کیا اور مؤقف اختیار کیا کہ کنٹرول لائن کے دونوں طرف کے کشمیریوں کو اپنے ہی وطن کے کسی بھی حصے میں آنے جانے کے لیے کسی دوسرے ملک سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ۔ یہی وہ مقدمہ تھا جس کے مکالمات ابتدا میں نذر قلم کیے ہیں۔ مقبول بٹ

اور اسکے ساتھیوں کو موت کی سزا سنا دی گئی اور انہیں سری نگر جیل میں منتقل کر دیا گیا ۔ مقبول بٹ آزادی کا متوالا تھا اس جیسا آزاد پنچھی پنجرے کی قید کو کہاں تسلیم کرنے والا تھا اس نے اپنے ساتھی میر احمد کے ساتھ مل کر جیل توڑنے کا منصوبہ بنایا۔

انہوں نے پہلے جیل کا جائزہ لیا ان کی کوٹھری کی عقبی دیوار میں سوراخ کر دیا جاتا تو وہ جیل سے باہر نکل سکتے تھے ۔مگر جیل میں وسائل نہیں ہوتے قیدیوں کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں تہی دست جیل کی دیواروں سے راستہ بنانا ناممکن کی حد تک دشوار ہوتا ہے ۔ لیکن جن لوگوں کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے وہ اسکے حصول کے لیے وسائل کی دستیابی کا انتظار نہیں کرتے بلکہ وہ وسائل بھی خود ہی مہیا کرتے ہیں ۔ سری نگر کی خون جما دینے والی سردی میں قیدیوں کو زندہ رکھنے کے لیے انگیٹھیاں فراہم کی جاتی تھیں جن میں کوئلے دہکتے تھے ۔ انہوں نے انگیٹھی سے ایک سلاخ نکال لی اور اسے کھدائی کے اوزار کے طور پہ استعمال کرنے لگے۔ منصوبے کے تحت مقبول بٹ شام کو اخبار پڑھنے کے بہانے باہر کی جانب بیٹھ جاتا کیونکہ وہاں روشنی ہوتی تھی جبکہ دوسرا ساتھی سلاخ سے دیوار میں چھید کرتا رہتا۔دن کے وقت دیوار پہ کمبل ٹنگا رہتا تھا۔ اس طرح معمولی سلاخ کو تیشۂ فرہاد کے طور پہ کام میں لاتے رہے اور نہایت ہی صبر اور استقامت سے اپنے کام کو انجام دیتے رہے۔

آزادی کا راستہ انتہائی کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے اس میں کئی بار ایسے موڑ آتے ہیں جہاں مایوسی بغلگیر ہو جاتی ہے اور ہمت جواب دے جاتی ہے کچھ ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہوا۔ جیل کی اندرونی دیوار مٹی سے بنی تھی جبکہ بیرونی جانب پتھر کا استعمال ہوا تھا۔ جب تک لوہے کی سلاخ نرم مٹی پہ چلتی رہی تب تک تو منزل آئے روز قریب آتی دکھائی دیتی تھی مگر جب یہی سلاخ سنگریزوں سے ٹکرائی تب مقبول بٹ کے ساتھی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور اس نے مقبول بٹ سے مایوسی کے عالم میں کہہ دیا کہ شاید ہمارے نصیب میں آزادی نہیں اور ساری صورتحال بیان کر دی۔ بلند حوصلہ مقبول بٹ نے اپنے شکستہ دل ساتھی کا حوصلہ بڑھایا اور اسے کام جاری رکھنے کو کہا۔ اسکے ساتھی نے دوبارہ کام کا آغاز کر دیا اور یہ دونوں معمولی سی سلاخ کے ساتھ پتھر کی دیوار سے راستہ نکالتے رہے۔ ایک دن مقبول بٹ نے دیکھا کہ اس کے ساتھی کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے یہی سمجھا کہ اس کا ساتھی ہمت ہار گیا ہے اور اب جیل کے اندھیروں سے لڑنا ہی قسمت میں ہے مگر آنسوؤں کی حقیقت دریافت کرنے پہ اسے معلوم ہوا کہ آزادی کی کرن جیل کی دیوار سے اندر داخل ہو چکی ہے۔ ڈیڑھ ماہ کی جان گسل محنت کی بدولت بالآخر سنگی دیوار نے آزادی کے متوالوں کے لیے راستہ چھوڑ دیا انہوں نے جلد از جلد آزادی سے بغلگیر ہونے کی ٹھانی اور جیل سے فرار ہو گئے اور یوں جیل ٹوٹ گئی۔ یہ کٹھن راہوں سے ہوتے ہوئے

آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ مقبول بٹ نے اپنا یہ جملہ سچ کر دکھایا کہ ابھی وہ رسی نہیں بنی جس سے مقبول بٹ کو پھانسی دی جائے۔

مقبول بٹ نے واپس آ کر اپنی تنظیم کو از سر نو منظم کیا اس پہ کئی مشکل دور آئے اسے مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑا کبھی اپنوں کے گھاؤ برداشت کرنا پڑے کبھی سیاسی زندگی کی مشکلات کو جھیلنا پڑا مگر وہ اپنے مقصد کے لیے کام کرتا رہا اس نے قوم کو آزادی کے راستے پہ لگانے کا عزم جو کر رکھا تھا۔ اسی مقصد کو ذہن میں لیے وہ 1976 میں دوبارہ کنٹرول لائن کو روند گیا۔ وہ اور اسکے ساتھی کشمیر میں گھومتے اور قوم کو آزادی کا درس دیتے رہے راکھ میں دبی چنگاری کو ہوا دے کر الاؤ جلانے کی کوشش کرتے رہے ۔ گھر گھر میں چراغ حریت جلانے کی سعی کرتے رہے۔ اسی اثناء میں مقبوضہ ریاست کی کٹھ پتلی انتظامیہ کو اس کی آمد کی خبر ہو گئی اور جلد ہی اسے ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا اور دوبارہ مقدمہ چلا۔ قانونی طور پہ ہر ممکن کوشش کی گئی کہ مقدمہ جیت لیا جائے مگر طاقت کے آگے دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ مقبول بٹ کو پرانی سزائے موت کے پیش نظر دلی کی تہار جیل منتقل کر دیا گیا یہاں اس نے آٹھ برس گزارے۔ اب کی بار بھارتی انتظامیہ نے رسی تیار کر لی تھی مقبول بٹ کو تہار جیل میں ہی 11 فروری 1984 کو پھانسی دے دی گئی۔ زندگی کی جیل ٹوٹ گئی اور مقبول بٹ کی روح قفس عنصری سے آزاد ہو گئی۔

ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ اک دیا بجھا تو سینکڑوں دیے جلا گیا

مقبول بٹ کی موت نے کشمیر کی تحریک آزادی میں نئی جان ڈال دی۔ واقعی شہید کا مشن تو اسکے بقول اس کی موت کے بعد ہی شروع ہوا۔ کشمیری قوم میں بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف غیض وغضب میں شدید اضافہ ہوا اور کچھ عرصے بعد مقبوضہ وادی کے نوجوانوں نے عسکریت کی راہ اپنا لی۔ وہ قوم جس نے تاریخ میں کبھی اسلحے سے کوئی یارانہ نہ رکھا تھا اس نے بندوق ہاتھوں میں اٹھالی اور بھارتی قابض افواج کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ ہندوستان کی آٹھ لاکھ فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ جموں وکشمیر کی سرزمیں پہ قائم بھارتی حکمرانی کی جیل ابھی تک توڑی نہیں جا سکی مگر آزادی کے متوالے دیواروں میں شگاف ڈالنے کے لیے سربکف اور برسرپیکار ہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی مقبول بٹ اور دیگر شہداء کی روحیں یہ خوشخبری سنیں گی کہ بھارتی جیل ٹوٹ گئی اور کشمیر آزاد ہو گیا۔۔۔۔۔۔

نوٹ: اس تحریر کے لیے مصنف نے مقبول بٹ شہید کے فرزند جناب جاوید مقبول بٹ صاحب سے ملاقات کی ہے اور مزکورہ معلومات انہی سے حاصل کردہ ہیں۔ مقبول بٹ کی سری نگر جیل سے فرار کی کہانی ایک اچھوتی اور خاص کہانی ہے۔

ہندو استدلال

چند روز قبل میاں الیف کے گھر چوری ہوئی اور چور چھوٹی موٹی اشیائے ضرورت کے ساتھ اسکا زیور بھی لے اڑے۔ یہ کسی بھی متوسط طبقے کے ایک سرکاری ملازم کے لیے ایک بڑا معاشی نقصان ہے جو میاں صاحب اور ان کے اہل خانہ کو برداشت کرنا پڑا۔ میاں صاحب نے حصول انصاف کی خاطر پولیس کا در کھٹکھٹانا چاہا مگر کچھ صاحب الرائے شخصیات کے کہنے پر وہ اس امر سے باز رہے۔اس امر سے ان کا اندیشہ تھا کہ پولیس جیبیں ٹٹولنے کے سوا کچھ نہیں کرے گی اور دیگر رشتہ داروں کو بلا وجہ تنگ کیا جائے گا اور قرابتداروں کے مابین پھوٹ پڑے گی۔ میاں صاحب کو معاملہ اللہ کے سپرد کرنے کو کہا گیا مگر وہ بھی تو آخر انسان ہیں ، نقصان کے ازالے کی بابت سوچتے رہے ۔میاں صاحب کو دراصل اپنی ایک رشتہ دار خاتوں پہ شک ہو گیا تھا۔ میاں صاحب کو سمجھایا گیا کہ وہ خاتوں کے بزرگوں سے ذکر کریں اور ان سے معاملے کو حل کرائیں ۔وہ براہ راست اس پہ الزام نہ لگائیں ۔لیکن میاں صاحب صبر نہ کر سکے اور حکمت کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس خاتوں پہ الزام لگا ہی بیٹھے۔ پہلے تو خاتون کے بزرگوں نے اپنے تئیں چھان بین کی اور تسلی کی کہ لڑکی بے گناہ ہے۔ چونکہ خاتون بے گناہ تھی اس لئے اسکے سسرال اور میکے والوں پہ یہ شاق گزرا کہ ان کی بیٹی کو خوامخواہ بدنام کیا گیا ہے

لہٰذا میاں صاحب خاتوں سے معافی طلب کریں۔اس صورتحال میں میاں صاحب کے رشتہ داروں اور خاتوں کے لواحقین کے مابین خلیج حائل ہو گئی۔اس صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیئے فریقین گاؤں کے چند بااثر افراد کے پاس ثالثی کے لئے پہنچ گئے۔ثالثی ارکان نے دونوں کا موقف سنا اور موقع بھی ملاحظہ کیا اور اس نتیجے پہ پہنچے کہ خاتوں نے چوری نہیں کی لہٰذا میاں صاحب خاتوں کے بزرگوں سے معذرت کریں اور معاملے کو رفع دفع کریں۔

یہ اپنی نوعیت کا ایک معمولی سا واقعہ ہے اس قسم کے بے شمار واقعات ہمارے گاؤں محلے میں روزانہ وقوع پزیر ہوتے ہیں۔لیکن اس چھوٹے سے واقعے سے معاشرے کے کتنے ہی عیب بے نقاب ہو گئے ہیں۔پہلا عیب تو یہ سامنے آتا ہے کہ حکومت کی طرف سے قانوں کی عملداری قائم کرنے اور عدل وانصاف کے ذمہ دار ادارے اس قدر بے وقار ہو چکے ہیں کے لوگ ان پہ اعتماد نہیں کرتے اور کسی بھی زیادتی کا شکار ہونے پر بھی ان اداروں سے دور ہی رہتے ہیں۔یہ وہ ریاستی اور سیاسی ظلم ہے جس کی چکی میں عوام گزشتہ دو صدیوں سے پس رہے ہیں۔اب اگر معاشرے پہ نظر دوڑائی جائے تو تمام قصور حکومت کا ہی نہیں۔لوگ ایک دوسرے کے مال کی حرمت سے بیگانہ ہو گئے ہیں کہ ایک شخص گھر سے باہر جاتا ہے تو دوسرا اسکا مال ہتھیا لیتا ہے اور اسکے پڑوسی بھی اس کے مال کی خبر نہیں رکھتے۔یہ ایک ظلم ہے جو ہم ایک دوسرے سے نظریں چرا کر کر رہے ہیں۔چوری اور

ڈکیتی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی ایک وجہ والدین اور اساتذہ کی عدم توجہ بھی ہے۔ والدین اور اساتذہ اولاد کی اخلاقی تربیت نہیں کر رہے جس کی وجہ سے نوجوان چوری اور ڈکیتی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ گویا اخلاقی ظلم کی وجہ سے معاشی ظلم جنم لیتا ہے اخلاقی جرم کے تخم سے قانونی جرم کا پودا ہی پھوٹتا ہے۔اسی طرح معاشی ظلم کا شکار شخص بے صبری کی وجہ سے بہتان جیسے ظلم کا ارتکاب کر لیتا ہے اور کسی کی عزت کو پاؤں تلے روند دیتا ہے۔اب اس ظلم کا شکار ہونے والے غصے کی پٹی آنکھوں پہ لپیٹ کر ایک اور ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں یعنی عصبیت جاہلیہ کی بنیاد پہ اپنے اپنے رشتہ داروں کو جمع کرتے ہیں اور ایک تنازعہ جنم لیتا ہے۔اب اس تنازعے کو حل کرنے کے لیے ایسے افراد کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو خود ظلم کے پروردہ ہوتے ہیں ان کے دل اللہ کے خوف سے عاری ہوتے ہیں اور وہ عدل وانصاف کیا ''الف ب'' بھی نہیں جانتے۔وہ اپنے مفادات کے تناظر میں فیصلے کرتے ہیں اور لوگوں کو مدتوں الجھائے رکھتے ہیں۔یہ ایک اور ظلم ہے کہ معاشرے کی زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں دی جاتی ہے جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔

اگر گاؤں کے ایک چھوٹے سے واقعے کو ملکی سطح پہ لے جائیں تو معلوم ہو گا کہ دہشت گردی جیسے بڑے مسئلے کے پیچھے کتنے بڑے مسائل پوشیدہ ہیں۔ایک اعلی تعلیم یافتہ شخص جب در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اس نظام سے مایوس ہوتا

ہے تو وہ درندگی پہ اتر آتا ہے۔ وہ بے روزگاری، غربت، استحقاق (میرٹ) کے قتل جاگیردارانہ نظام کے ظلم اور کرپشن مافیا کے خلاف اٹھتا ہے لیکن خود کو ایک بڑے ظالم، کے روپ میں بدل دیتا ہے۔ وہ دہشت گرد بن جاتا ہے اور معصوم عوام کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیتا ہے۔ وہ چور اور ڈکیت بن کر لوگوں کے مال و جان سے کھیلتا ہے یا کسی مافیا کا حصہ بن کر روئے زمیں فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے۔

حاصل بحث یہ کہ ہم ایک کے بعد ایک ظلم کے نظام میں جکڑے ہوئے ہیں اور یہ ظلم ہمارے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے جس کا اظہار ہم قدم بہ قدم کرتے نہیں تھکتے۔ ہم مظلوم معاشرہ، ستم رسیدہ قوم یا استحصال کا شکار عوام کہلاتے ہیں مگر فی الحقیقت ہم ظالم سماج ہیں جو حتی المقدور ظلم ڈھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اس ملک میں تبدیلی کے خواہاں افراد اور جماعتیں؛ افراد اور معاشرے کی مظلومیت کو سامنے رکھ کر تبدیلی کا نعرہ لگاتے ہیں مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ تصویر کا دوسرا رخ کس قدر بھیانک ہے اس میں امن و محبت کے رنگ بھرنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص اپنی غلطیوں کا بہتریں وکیل ہے اور دوسروں کے لیے وہ قاضی بن بیٹھتا ہے وہ اپنے لیے تو انصاف کا خواہشمند ہے مگر خود انساف کرنے کو تیار نہیں اگر ہر شخص اپنا محاسبہ کرے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرے تو معاشرے میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ ہمارے انقلابی ذہن رکھنے والے تبدیلی کے خواہاں اس بھول پن میں گرفتار ہیں کہ عدالتی نظام بہتر کر لیا جائے تو نجات

مل جائے گی ، یا پولیس کے نظام میں بہتری کر کے معاشرے میں تبدیلی آ جائے گی ، یا محض ایوانوں میں چہرے بدل دیے جائیں تو ملک بحرانوں سے نکل سکتا ہے۔ جبکہ اسکے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اگر اس ملک و معاشرے کو ظلم سے پاک کرنا ہے تو انقلاب ناگزیر ہے مگر یہ انقلاب ذہنی تبدیلی سے مشروط ہے کیونکہ معاشرے کے ادارے ہی نہیں بلکہ ہر فرد ظلم کے نظام کا باقاعدہ حصہ بنا ہوا ہے۔ معاشرے کے ظالم افراد کے قلب وذہن کو ظلم سے پاک کر کے اس میں ایمان، علم ، عدل اور حیاء جیسی اقدار کو راسخ کرنا ہوگا اور انہیں اسکا عملی نمونہ بنانا ہوگا۔ظالم معاشرے کے افراد کی تربیت کے ذریعے انہیں عدل و انصاف کا پیامبر بنانا ہوگا۔ یہ یقیناً وقت طلب اور وقت کا متقاضی امر ہے ۔معاشرے کو سیدھی راہ پہ گامزن کرنے کا واحد طریقہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یہ ہماری دینی ذمہ داری ہے کی حتی المقدور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں ۔انفرادی طور پر خود اس فریضے کو انجام دیں اور اجتماعی طور پہ جو جماعتیں اس فریضے کو انجام دے رہی ہیں ان کے قدم مضبوط کریں ان کے دست و بازو بنیں۔ یہی ایک راستہ ہے جس پہ چل کر ہم امت وسط یعنی ایک معتدل قوم بن سکتے ہیں اور ہمارے مسائل عدل کی بنیاد پہ حل ہو سکتے ہیں۔یہی وہ انقلاب ہے جسکی ہمیں ضرورت ہے مگر۔۔۔۔۔

تو کسی انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر

جو ہو سکے تو خود اک انقلاب پیدا کر۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

گزشتہ چند دن سے یمن کی صورتحال زبان زدِ عام ہے۔ نجی محافل میں گرما گرم تبصرے ہو رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کو تو ایک موضوع بحث مل گیا جس پہ ہر نجی ٹی وی گرما گرم مباحثے کروا رہے ہیں۔ اس موقع پر سیاسی جماعتوں نے اپنے مؤقف کا بھرپور اظہار کیا۔ حکومت وقت نے اس نازک صورتحال سے نمٹنے کے لیے مجلس شوریٰ کے دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کیا۔ اجلاس میں معزز ممبران نے کھل کر اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے ہر رکنِ مقننہ کو جوشِ خطابت دکھانے کا بھرپور موقع ملا جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ایک دوسرے پہ لفظی تیر اندازی کی۔ ماسوائے محدودِ چند سیاست دانوں کے کسی کی طرف سے بھی سنجیدگی کا مظاہرہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ حکومتی وزراء نے اس موقع کو پی ٹی آئی پہ پھبتیاں کسنے کے لیے غنیمت جانا جبکہ حزب اختلاف نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میاں برادران سعودیہ کے شاہی خاندان سے اپنی ذاتی دوستی نبھا رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ سعودی خاندان سے کوئی خفیہ معاہدہ بھی کر چکے ہیں۔ بہر حال اس سارے منظرنامے میں پاکستان کی مقننہ نے مشترکہ قرارداد بھی پاس کی جس کی رو سے تمام سیاسی جماعتوں نے پاکستان کو غیر جانب دار ثالث کا کردار ادا کرنے اور خطرے کی صورت میں سعودی عرب کی

فوجی امداد کرنے پہ اتفاق کیا گیا ہے۔ ہمارا میڈیا حسب سابق سنسنی پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ حقائق کو پس پشت ڈال کر محض سستی شہرت کے حصول کے لیے اس کو مختلف رنگ دے کر عوام میں شکوک و شبہات پھیلائے جا رہے ہیں۔ انہی شکوک و شبہات کی وجہ سے قوم شدید مخمصے کا شکار ہے۔

ایک رائے یہ پھیلائی جا رہی ہے کہ یمن میں جاری خانہ جنگی شیعہ سنی جنگ ہے لہٰذا پاکستان کو اس میں نہیں کودنا چاہیے ورنہ پاکستان میں بھی یہی جنگ اپنے عروج تک پہنچ جائے گی۔ اس رائے کی وجہ وہ یہ قرار دے رہے ہیں کہ حوثی چونکہ شیعہ زیدیہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہ شیعہ سنی جنگ ہے۔ حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ باغیوں میں شیعہ اور سنی دونوں شامل ہیں۔ باغیوں کا تعلق القاعدہ اور داعش جیسی تنظیموں سے ہے۔ یمن میں اس سے قبل مذہبی رواداری کا عالم تھا۔ شیعہ اور سنی ایک ہی مسجد میں اکٹھے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ یمن کے شیعہ زیدیہ ہیں جو اہل سنت والجماعت سے انتہائی قریب ہیں۔ البتہ حوثی باغیوں کے پر تشدد اقدامات نے فضاء کو مخدوش کر دیا ہے۔ اگر اس جنگ کو روکا نہ گیا تو بعد ازاں یہ شیعہ سنی نزاع کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ پاکستان میں موجود شیعہ اور سنی تنظیموں نے علیحدہ علیحدہ طور پہ اپنے اپنے حلیفوں کے حق میں مظاہرے کیے ہیں۔ سنی مسلک کی بنیاد پہ قائم جماعتوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ سعودیہ کے ساتھ بھرپور فوجی تعاون کریں۔ جبکہ

دوسری جانب شیعہ مکتبہ فکر کی جماعتوں نے حکومت پر اس جنگ سے باہر رہنے کیلئے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ یمن میں شیعہ سنی کی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہی اسے ایسا رنگ دینا چاہیے۔ میڈیا کو مسلکی بنیاد پہ عوامی جذبات کو مشتعل کرنے سے باز رہنا چاہیے۔

جہاں کچھ لوگ اسے مسلکی جنگ قرار دے رہے ہیں وہیں میڈیا میں اسے سعودی عرب اور یمن کے مابین جنگ قرار دیا جا رہا ہے اور ہمارے سیکولر طبقات حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ دوسرے ممالک کے درمیان جاری جنگ کا خود کو حصہ نہ بنایا جائے۔ اسی طرح بعض حلقوں نے اسے سعودیہ اور ایران کے مابین سرد جنگ بھی قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایران نے اس جنگ میں اپنا کردار ادا کرنے کی پیشکش بھی کر دی ہے۔ ان لوگوں کا ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ یہ محض پاکستانی اور سعودی حکمرانوں کے درمیان معاہدے ہیں اور ان کا خمیازہ پاکستان کی عوام کو بھگتنا پڑے گا۔ حالانکہ جب معاملہ دو ممالک کے درمیان آ جائے تو وہ ذاتی نہیں رہتا بلکہ بین الاقوامی ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ جنگ نہ تو یمن اور سعودی عرب کی ہے اور نہ ہی اسکا تعلق عرب ایران سرد جنگ سے ہے بلکہ یہ جنگ ان عناصر کے خلاف ہے جو ایک قومی حکومت کے خلاف صف آرا ہیں۔ حیرت تو اس بات پہ ہے کہ پاکستان کی حکومت کے خلاف برسرپیکار طالبان کے خلاف تو یہ لوگ مذاکرات کو حرام اور شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں اور

یمن میں اسی طرح کے باغیوں کے ساتھ بات چیت کو ہی مسئلے کا حل تصور کیا گیا ہے۔

آخر یہ دورنگی کیوں ؟

یمن کا مسئلہ قدیم ہے اور ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ محض چند سال یا ماہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کہ سمجھنے کے لیے تاریخ سے رہنمائی لینا ہو گی۔ یمن جزیرہ نما عرب کے جنوب میں ایک پٹی کی صورت میں پھیلا ہوا ملک ہے جو ایک قدیم تاریخ رکھتا ہے ۔اہل عرب کے لیے یہ ایک تجارتی مرکز تھا۔ قریش شام اور یمن کی طرف تجارتی قافلے بھیجا کرتے تھے۔ یہی ملکہ سبا کا مسکن تھا جو حضرت سلیمانؑ کی دعوت پہ ایمان لائی ۔ ملکہ سبا کیپیش روؤں نے یمن کو خوب ترقی دی۔ معرب ڈیم کی تعمیر سے یمن کی زراعت نے عروج حاصل کیا اور معرب ڈیم کی تباہی تک یہ خطہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں کے باسیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کو حق جان کر قبول کیا لیکن یہیں پہ اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا اور بڑی تعداد میں اہل ایمان کو انگاروں سے بھری خندقوں کی نذر کر دیا گیا۔ باقی ماندہ کو بزور قوت کفر میں مبتلا کیا گیا۔ بعد میں ابرہہ نے اس علاقے پہ قبضہ کیا۔ اس نے خانہ کعبہ پہ حملہ بھی کیا جو ابابیلوں کے غنڈ نے ناکام بنا دیا۔ نبی ﷺ کے عہد میں حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایمان قبول کیا اور ان کی بدولت اسلام کی کرنیں یمن تک پہنچیں۔ نبی ﷺ نے اہل یمن کی تعلیم کے لیے حضرت معاذؓ بن جبل کو بطور امیر یمن بھیجا۔ یمن میں اسلام عہد نبوت ﷺ سے ہی جڑیں پکڑ گیا تھا۔ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد یمن دو علیحدہ

مملکتوں یعنی شمالی یمن اور جنوبی یمن میں منقسم رہا۔ دونوں ریاستوں کے مابین جنگیں ہوتی رہیں۔ بالآخر گزشتہ صدی کے اواخر میں عرب ممالک کی کوششوں سے دونوں یمن ایک ہو گئے۔ یمن کے مطلق العنان حکمران علی عبداللہ صالح نے تقریباً تیس برس حکومت کی۔ عرب بہار میں جہاں دیگر اسلامی ممالک میں سیاسی تبدیلیاں وقوع پزیر ہوئیں وہیں 2012ء میں یمن میں بھی علی عبداللہ صالح کی حکومت کو زوال آیا۔ یمن میں تمام جماعتوں کی باہمی مشاورت سے قومی حکومت تشکیل دی گئی اور متفقہ طور پہ منصور ہادی کو صدر بنایا گیا۔ ابھی اس حکومت کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ حوثی باغیوں نے سابق صدر کی حمایت سے حکومت پہ حملہ کر دیا اور دارلحکومت پہ قبضہ کر لیا۔ یمن کے متفقہ صدر عدن میں پناہ لینے پہ مجبور ہوئے۔ یمن کی قومی حکومت نے امداد کے لیے سعودی عرب سے درخواست کی۔ سعودی عرب نے یمنی حکومت کی تائید کی تو باغی حوثیوں نے سعودی عرب اور حرمین الشریفین پہ حملے کی دھمکی دے دی۔ اس دھمکی کو سعودی عرب نے اپنی سلامتی کے لیے خطرہ جانتے ہوئے پاکستان سے فوجی تعاون کی اپیل کی ہے۔ یہ ہے اصل صورتحال جس پہ بحث چل رہی ہے۔

اگر اصل صورتحال کو سامنے رکھا جائے تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے اور پاکستان کا کردار بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر سیاسی، عسکری اور معاشی بنیادوں پہ پاکستان کے سعودی عرب سے تعلقات کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت اظہر من الشمس

ہے کہ سعودی عرب نے ہر مشکل میں پاکستان کی غیر مشروط مدد کی ہے خواہ وہ پاک بھارت جنگیں ہوں، سیلاب ہوں یا زلزلے سعودی عرب نے پاکستان سے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔اسکے علاوہ پاکستان کے لاکھوں افراد سعودیہ اور دیگر عرب ممالک میں مزدوری کرتے ہیں۔یہ بیرون ملک پاکستانیوں کا تقریبا80% ہے اور اسی تناسب سے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی جانب سے حاصل یہ آمدن قومی خزانے کو مل رہی ہے ۔اسکے علاوہ قرض اور مالی امداد کی مد میں سعودی عرب پاکستان کی مسلسل امداد کر رہا ہے۔عسکری، سیاسی اور معاشی اعداد و شمار اور سعودی پاک تعلقات کا تقاضا تو یہ ہے کہ سعودی عرب کی بھرپور فوجی امداد کی جائے لیکن پاکستان کے آئین اور دین اسلامی کی تعلیمات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک بڑا کردار پاکستان کا منتظر ہے۔اور وہ بڑا کردار یہ ہے کہ جنگ کے شعلوں کو بجھا کر امت مسلمہ کو جانی و مالی نقصان سے بچایا جائے۔اس سلسلے میں پاکستان کو مندرجہ ذیل اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔

ا۔ پاکستان کو فوراً اسلامی سربراہی کانفرنس کا اجلاس طلب کرنا چاہیے اور تمام مسلم امہ کو ساتھ لے کر اس مسئلے کا حل نکالنا چاہیے۔اگر سفارتکاری اور گفت و شنید سے معاملے کا حل ممکن ہو تو پہلی ترجیح میں اس حل کی جانب بڑھنا چاہیے۔لیکن اگر ایسی صورت نہ بن پائے تو بغاوت اور زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف طاقت کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔پاکستان دیگر اسلامی

ممالک کے ساتھ مل کر ایک امن فوج تشکیل دے جو مسلم ممالک میں امن کے قیام کو یقینی بنانے اور تصفیہ طلب امور کو نمٹانے کے لیے استعمال کی جائے۔ اس بات کی ہر گز اجازت نہیں دی جا سکتی کہ غیر مسلم لشکر یہاں آ کر اپنے عزائم پورے کرے۔

۲۔ سعودی عرب کا تقدس تمام مسلم ممالک کے لیے مسلم ہے کیونکہ وہاں حجاز مقدس ہے ۔ باغی گروہ کا تعلق انتہا پسند جماعتوں سے ہے اور ماضی میں ان جماعتوں نے جنگ میں کسی اخلاقی اقدار کا پاس نہیں رکھا۔ قتل انسانیت میں انتہائی بیدردی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان سے کوئی بعید نہیں کہ وہ حرمین الشریفین کے تقدس کو بھی پامال کریں۔ اس لحاظ سے سعودیہ کا تحفظ کرنا اور ان مقامات کو دہشتگرد عناصر سے محفوظ رکھنا تمام امت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ سعودی عرب کے تحفظ کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں اپنی فوج بھیجی جائے۔ مسلم ممالک کی مشترکہ فوج کی موجودگی میں باغیوں پہ یہ خوف طاری ہو گا کہ کی وجہ سے (Detterence) عالم اسلام کا ہر فرد ان سے برسرپیکار ہے اور اس خوف وہ سعودیہ پہ حملے سے باز رہیں گے۔

۳۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ عالمی ضمیر کو بیدار کرانے میں اپنا کردار ادا کرے۔ اقوام متحدہ میں اس مسئلے کو لے جائے اور یمن کی قانونی حکومت کا

مقدمہ لڑے۔اسکے علاوہ کامیاب سفارتکاری کے ذریعے دیگر ممالک کو اپنا ہمنوا بنائے۔
۴۔یہ تنازعہ امت کا واحد تنازعہ نہیں ہے۔اس کے علاوہ بھی کئی معاملات ہیں جہاں پاکستان کا کردار نہایت اہم ہے لیکن وہاں سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا۔اگر وہاں پاکستان اپنا مثبت کردار ادا کرتا تہ آج پاکستان کی حیثیت ایک مضبوط فیصلہ ساز اور منصف کی ہوتی۔مثلاً مصر کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹا گیا اور وہاں فوجی آمریت اقتدار پہ قابض ہوئی ہزاروں افراد کی جان لی گئی۔اور اب بھی جمہوری قوتوں کو سزائے موت سنائی جا رہی ہے۔وہاں عربوں نے مصری آمریت کا ساتھ دیا اور پاکستان بھی خاموش رہا۔ اب یمن کی جمہوریت کیونکر مصر کی جمہوریت سے بہتر ہو گئی ؟اسی طرح بنگلہ دیش میں پاکستان دشمنی کا مظاہرہ ہو رہا ہے اور ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی حمایت کرنے والے بنگالیوں کو تختۂ مشق بنا دیا گیا ہے اس پہ چپ سادھ لینے کی وجہ سمجھ سے باہر ہے۔امت کو مل کر ان مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے اور پاکستان کا کردار اس میں کلیدی ہے۔ اگر پاکستان کے ارباب اختیار اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اپنا کردار ادا کریں تو دنیا کو خاص کر امت مسلمہ کو جنگ کی تباہکاریوں سے محفوظ

رکھا جا سکتا ہے اور بڑی طاقتوں کو اپنے استعمار کے لیے دوسرے ممالک میں قتل وغارت گری کا کھیل کھیلنے سے روکا جا سکتا ہے۔اس وقت امت مسلمہ میں یہ شعور عام کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنی توانائیاں اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف استعمال کی جائیں نہ کہ آپس میں باہمی جھگڑوں کی نذر کی جائیں۔ اگر امت مسلمہ مل کر اس مسئلے سے نبرد آزما ہو جائے تو ہم یہ توقع کر سکیں گے کہ مستقبل میں ہم فلسطین، کشمیر، افغانستان اور عراق کے مسائل بھی خود ہی حل کر لیں گے۔ دوسروں پہ انحصار کرنے کے بجائے اپنے قدموں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی جائے تو کامیابی ہمارا مقدر ہو گی۔ اگر پاکستان کی حکومت نے وقت کی نزاکت کو بھانپ کر صحیح سمت میں قدم اٹھائے تو مسلم دنیا کو منڈلاتی جنگ کے منحوس سائے سے بچایا جا سکتا ہے اور اس کاوش کی بدولت تاریخ ہمیں امن کے پیامبر کی حیثیت سے یاد رکھے گی۔

مسلکی نزاع سے نجات کی راہیں

اگر ہم اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑائیں تو ہمیں مسلم معاشرہ تقسیم در تقسیم کی صورتحال سے دوچار نظر آئے گا۔ جہاں یہ معاشرہ رنگ، نسل، زبان، علاقے، پیشے، اور معاشی مقام کی بنیاد پہ تقسیم ہے وہیں پہ ہمیں مسلکی یا فقہی اختلافات بھی اسے تقسیم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ قابل تشویش بات یہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں یہ مسلکی تناؤ ایک باقاعدہ نزاع (Secterian Conflict) یا فرقہ وارانہ تشدد (Secterian Voilence) کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آئے روز مسلکی بنیادوں پہ جھگڑے اور قتل و غارتگری معمول ہی بن کر رہ گیا ہے۔ اب تو مساجد و مدارس کے باہر تختیاں آویزاں کی جاتی ہیں کہ یہ مسجد فلاں مسلک کی ہے۔ کسی سے دین کی بات کریں تو وہ اس کے صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے آپ کا مسلک جانے گا اگر آپ اس کے مسلک سے ہیں تو صحیح ورنہ غلط۔ یہ امر انتہائی ناقابلِ فہم نظر آتا ہے کہ جس دین کی تعلیمات نے عہد جاہلیت کے قائم کردہ تعصبات کو مٹا کر تمام لوگوں کو محبت و اخوت کی لڑی میں پرویا تھا آج اسی دین کے پیروکار باہم دست و گریبان کیوں ہیں۔ حالانکہ قیامت تک امت مسلمہ کے لیے دین کے واضح احکامات ہیں کہ:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔ واذکروا نعمت اللہ علیکم اِذ کنتم

اَعدآئً فاَلّف بین قلوبکم فاَصبحتم بنعمتہ اِخواناًو کنتم علی شفا حفرۃ من النار فاَنقذکم منھا کذٰلک یبین اللہ لکم اٰیتہ لعلکم تھتدون۔ (سورۃ آل عمران۔ ۱۰۳) ترجمہ: اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمھارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی اور تم اسکی نعمت کے نتیجے میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ تم آگ کے گڑھے میں گرے جا رہے تھے کہ اس نے تمہیں بچا لیا اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں ظاہر کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پکڑو۔

اسی طرح حدیث نبوی میں بھی تمام امت کو ایک جسد واحد قرار دیا ہے۔ ایسی صریح تعلیمات کے حامل دین کے پیروکاروں میں شرعی مسائل پہ افتراق، نزاع اور جنگ و جدل کا ہونا صرف اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ امت اکے افراد نے انفرادی اور اجتماعی طور پہ دین پہ عملدرامد ترک کر رکھا ہے۔ مسلکی اختلافات کو نزاع تک لے جانے اور فاصلوں کو خلیج کی طرح بڑھانے میں بلاشبہ بنیادی کردار بیرونی سامراج نے ادا کیا ہے ۔لیکن یورپی سامراج کو اپنی صفوں میں گھس آنے اور کھیل کھیلنے کا موقع اور اجازت تو ہم نے خود ہی دی ہے۔

کسی شرعی معاملے میں علماء کرام کا ایک رائے اختیار کرنا مسلک کہلاتا ہے

عربی زبان میں اسے مذہب بھی کہا جاتا ہے۔ علماء کرام اگر کسی معاملے میں کسی ایک رائے پہ عملدرآمد کریں تو کہا جائے گا کہ انہوں نے فلاں مسلک اختیار کیا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے رائے کے اظہار کا بھرپور موقع فراہم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانی جبلت کو سمجھتے ہوئے کچھ قدغنیں بھی عائد کرتا ہے۔ دینِ عدل ہونے کے ناطے وہ عدل کو ہر جگہ ملحوظِ خاطر رکھتا ہے
۔ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ کوئی بھی مسلک اختیار کرے لیکن یہاں قدغن یہ ہے کہ پیروی اسی رائے کی کی جائے گی جو قرآن و سنت کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہ ہو۔ گویا اختلاف رائے کا حق مشروط کر دیا گیا ہے علمِ دین سے۔ یہ اختلاف باعث برکت ہے کیونکہ اس نے تحقیق کے نئے آفاق سے دنیا کو روشناس کرایا ہے۔ علم کی روشنی سے تمام جہاں کو منور کیا ہے۔ یہ جو آج چار سو اجالا اور ترقی و شادمانی ہے یہ اسی تحقیق کا نتیجہ ہے جس نے عقل کے بند دریچوں کو تدبر اور تفکر کے لیے کو کھولا ہے۔آج بھی ہم اختلاف سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ یہ اختلاف علماء کرام کی مجالس تک محدود رہے اور اسے ممبر و محراب کی زینت نہ بنایا جائے۔

اسلام نے اپنے تمام پیروکاروں کے لیے علم کا حصول فرض (لازم) قرار دیا ہے۔ نبی کا فرمان ہے کہ : طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے) ۔کچھ لوگوں (فرض کفایہ) پہ یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ

وہ دین کے علم میں مہارت اختیار کریں اور دوسروں کو سمجھائیں۔اس طرح اسلام مسلم امت کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ایک علماء اور دوسرے عامۃ الناس Common People)) ۔عامۃ الناس سے مراد اَن پڑھ اور گنوار نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو دین کا گہرا علم نہیں رکھتے۔اگر اسلامی تعلیمات پہ بعینہٖ عمل ہو رہا ہو تو عامۃ الناس بھی علم کا سمندر ہوں گے اور علماء تو آسمان کی وسعتوں پہ ہوں گے۔ یہ حالت ہو تو برکات کا سلسلہ زمین و آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ لیکن ہم آج جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں ہم اتنے خوش قسمت نہیں۔ ہمارے دونوں طبقات اس معیار کو نہیں پہنچتے۔ان طبقات کو علیحدہ علیحدہ جانچا جائے تو باہمی نزاع کی وجوہ بھی سمجھ میں آ جائیں گی۔

عامۃ الناس کا جائزہ لیں تو اختلافات اور نزاع کی مندرجہ ذیل وجوہات سمجھ میں آتی ہیں

ا۔ عامۃ الناس عربی زبان سے ناواقف ہے جبکہ دین کی بنیادی تعلیمات عربی زبان میں ہیں ۔غیر عرب مسلم معاشروں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو از خود اخذ کر سکیں ۔وہ کسی سہارے یا واسطے کے بغیر مفاہیم تک رسائی نہیں رکھتے اور جو بھی ان کے اور تعلیمات کے درمیان پل بنتا ہے وہ اسکی تقلیدِ اعمیٰ (اندھی تقلید) کرتے ہیں ۔اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ عبادات و معاملات میں اپنے بزرگوں

کی پیروی کی جاتی ہے اور اگر کوئی اصلاح کی غرض سے راہنمائی کر دے تو اس کی مخالفت شروع کر دی جاتی ہے اور اپنی بات پہ محض اسلیے قائم رہا جاتا ہے کہ اپنے بزرگوں کے طریق کار کو کیونکر چھوڑا جائے۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عام نہیں کیا جاتا۔ عامۃ الناس کو اصول نہیں بتائے جاتے جبکہ انہیں فروع بتا دیے جاتے ہیں۔ ہر شخص یہ تو ضرور جانتا ہے کہ کتنی نمازیں فرض ہیں اور ہر نماز میں کتنی رکعتیں فرض، کتنی واجب اور کتنی سنت ہیں لیکن اسے یہ ہرگز پتہ نہیں کہ یہ فرض کیا چیز ہے، واجب کیا چیز ہے اور سنت کیا چیز ہے۔ اسلیے جب بھی کبھی دو مختلف مسالک کے لوگ آمنے سامنے ہوتے ہیں تو وہ انہی مصطلحات پہ جھگڑ پڑتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کہے کہ فلاں چیز دین میں فرض ہے اور دوسرا کہہ دے کہ واجب ہے تو ان کے درمیان لڑائی شروع ہو جائے حالانکہ دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ اختلاف اصل میں یہ ہے کہ ایک فریق کہے کہ یہ عمل جائز ہے اور دوسرا کہے کہ یہ ناجائز ہے۔ اگر اس طرح کے مسائل کو تلاش کیا جائے تو وہ بہت ہی کم ملیں گے۔ زیادہ تر معاملات میں ہمیں اتفاق ہی نظر آتا ہے۔

۳۔ عامۃ الناس کو جو علم عطا کیا جاتا ہے اسے وہ اسے عملی زندگی میں منطبق ہوتے دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے وہ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اس پہ عملدرامد ہو ہی نہیں سکتا۔ خصوصا مغربی تہذیب کی چکا چوند نے ان کی آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ دین کی تعلیمات موجودہ دور میں قابل عمل نہیں

ہیں۔

۴۔ مسلم معاشروں میں ایک وبا یہ بھی ہے کہ بہت ساری علاقائی رسومات اور روایات کو دین کا حصہ سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ ان کا دین سے کوسوں دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً عورتو پہ تشدد کیا جاتا ہے تو یہ سمجھ کر کہ دین نے مرد کو عورت پہ حاکم بنایا ہے اور حاکم کو تشدد کی اجازت ہے حالانکہ دین اسلام میں ایسی کوئی تعلیم نہیں کہ کسی دوسرے انسان پہ تشدد کیا جائے۔اسی طرح دیگر رسم و رواج ہیں جو شریعت اسلامی کی تعلیمات کے سراسر منافی ہیں لیکن انہیں دین کی منشا سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔

اگر طبقۂ علماء کا جائزہ لیا جائے تو ان کے مابین باہمی نزاع کی مندرجہ ذیل وجوہات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ا۔ جن افراد کو دین کے لیے مختص کیا جاتا ہے وہ اس اہم ذمہ داری کے لیے اہل نہیں ہوتے۔اکثر وہ طلبہ جو اسکول کی پڑھائی میں کمزور ہوتے ہیں یا پھر مالی طور پہ کمزور ہوتے ہیں انہیں دینی مدارس میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ایسے افراد سے مستقبل میں کیا امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔اس پہ مستزاد یہ کہ یہ طلبہ وظیفہ جمع کرنے کی مہم میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے وہ دست سوال دراز کرنا سیکھ جاتے ہیں اور خودداری ان کی رگ و پے سے نکل جاتی ہے۔ایسے علماء اپنی قوم کو پاؤں پہ کھڑا کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں قوم کی امامت کرنے کی سکت ہوتی ہے۔بقول اقبال :

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لاالہ الااللہ

۲۔مدارس دینیہ نے علوم اسلامیہ کی ترویج کی بھاری ذمہ داری اٹھائی ہے لیکن وہ محض کسی ایک مسلک میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مدرسے میں پڑھنے والے طلبہ اور وہاں پڑھانے والے اساتذہ ایک خاص فقہی مسلک سے وابستہ ہوتے ہیں انہیں کسی دوسرے مسلک کے علماء کی ہوا تک نہیں لگتی۔ ان مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے مسلک پرست بن جاتے ہیں اور دیگر مسالک کو اپنا مدمقابل یا حریف سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے مسلک کے علماء اور اکابرین کی رائے سے اختلاف کرنا تو درکنار، مختلف رائے کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس صورتحال میں وہ علمی جمود کا شکار ہو جاتے ہیں اور تمام تر توانائیاں اپنے مسلک کے دفاع اور اسے نمایاں کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ یہیں سے قدورتیں جنم لیتی ہیں اور بعدازاں یہ مخاصمت بڑے نزاع کا باعث بنتی ہے۔

۳۔مدارس دینیہ میں ایک ہی مسلک کی تعلیم کے نتیجے میں علماء کتمانِ علم اور کتمانِ حق کے بھی مرتکب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کسی بھی مدرسے کے فارغ التحصیل فرد سے دریافت کیجیئے کہ قرآن پاک کے بعد صحیح ترین کتاب کون سی ہے تو وہ صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) کا ذکر کرے گا۔ اور ان کی صحت کے حوالے سے آپ کو قائل کرنے کے لیے دلائل بھی دے گا۔ لیکن اسی وقت اگر آپ انہی کتب میں سے کوئی ایسی حدیث نبوی اس کے سامنے پڑھیں جو اس کے مسلک کے خلاف

جاتی ہو تو وہ فوراً اس حدیث کے مقابلے میں اپنے اکابر علماء کے اقوال پیش کر دے گا۔یعنی نبی کے قول پہ اکابر علماء کی رائے کو فوقیت دے ڈالے گا حالانکہ اکابرین نے بھی رائے کسی دلیل پہ ہی قائم کی ہو گی جس سے وہ بے خبر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان مدارس میں وہ احادیث پڑھائی ہی نہیں جاتیں جو مسلک کی رائے سے مختلف ہوں۔اگر کوئی اور شخص بھی ان کے متعلق استفسار کرے (فتوی طلب کرے) تو ان کے بتانے سے گریز کیا جاتا ہے اور اگر مگر کے ذریعے اپنا من پسند مفہوم بتا دیا جاتا ہے۔عام افراد کو احادیث نبوی کی مستند کتابیں پڑھنے سے بھی روکا جاتا ہے تاکہ وہ ان احادیث تک رسائی حاصل نہ کر لیں۔اسی طرح ایک بڑے عرصے تک علماء قران پاک کا ترجمہ اور تفسیر بھی عام افراد کے سامنے نہیں کیا کرتے تھے۔یہ بدترین علمی بددیانتی ہے جس کے مرتکب بدقسمتی سے ہمارے علماء ہو رہے ہیں۔

۴۔دنیا کو اندھیروں سے نکال کر اجالوں میں لانے والے ہمارے علماء ہی تھے۔سائنس کو ترقی دینے والے ہمارے علماء ہی تھے لیکن گزشتہ دو صدیوں میں جب یورپی استعمار نے اپنے پنجے گاڑھے تو علماء کرام نے استعمار کے سامنے اپنے علمی ہتھیار ڈال دیے ۔جدید علوم کو مغربی استعمار کے حوالے کر کے خود دینی علوم کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔گزشتہ صدی میں جدید علوم دینی مدارس میں شجر ممنوعہ بنے رہے۔اگر کچھ علماء (سرسید احمد خان وغیرہ) نے جدید علوم کو اپنانے کی کوشش کی بھی تو انہی سامراجی قوتوں کے رنگ میں رنگ کر

۔اس سے دین اور دنیا کی تفریق پیدا ہو گئی اور علماء کرام معاشرے کو اسی مقام پہ لے آئے جہاں یورپی سامراج انہیں لانا چاہتا تھا۔ یعنی دین کو معاشرے اور ریاست سے بے دخل کر دیا جائے اور اسے محض ایک فرد کے ذاتی معاملے تک محدود کر دیا جائے جیسا کہ وہ خود یورپ میں کر چکے تھے۔جدید علوم سے دوری کے سنگین نتائج کا اندازہ اس ایک مثال سے لگا لیجیئے کہ علم الفرائض (علم میراث) اسلامی تعلیمات میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ نبی نے اسے نصف علم قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ قرب قیامت اس علم کو دنیا سے اٹھا لیا جائے گا۔ یعنی اس کی تعلیمات اور اس پہ عملدرامد مفقود ہو جائے گا۔ علماء کرام یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن مدارس کی اکثریت میں علم الفرائض پڑھایا ہی نہیں جاتا اور جہاں پڑھایا جاتا ہے وہاں بھی اختیاری مضمون کی حیثیت سے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ علماء کرام ریاضی سے ناآشنا ہیں اور اس علم میں حساب کتاب ہوتا ہے جو ریاضی کی بنیادی تعلیمات کا متقاضی ہے۔ جدید علوم سے لاتعلقی کی وجہ سے ہم کتنے ہی دینی علوم کی روح سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ایک طرف وہ لوگ تھے جو دنیوی علوم پہ دسترس رکھتے تھے لیکن دین سے بیگانہ تھے اور دوسری جانب دینی علوم کے حامل لوگ جو دنیاداری سے بیگانہ تھے۔ تیزی سے ترقی کرتی دنیا کے جدید مسائل کے حل کے حوالے سے پیدا اختلافات نزاع کا باعث بنے اور اس پائے کے علماء کرام موجود نہ تھے کہ اس نزاع میں بیچ کا راستہ نکالتے۔

اختلافات کے حل کے لیے بنیادی ذمہ داری مسلم حکمرانوں پہ عائد ہوتی ہے لیکن مسلم دنیا کے حکمران طبقہ علماء سے تعلق نہیں رکھتے اس لیے وہ ان مسائل کے حل میں سنجیدہ بھی نہیں۔ان حکمرانوں نے دنیوی امور کو نمٹانے کے لیے بھی افسر شاہی کا ایک محکمہ پال رکھا ہے جو ان حکمرانوں کو لٹو کی طرح گھماتا ہے ایسی صورتحال میں ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس مسئلے کا حل نکالیں گے عبس ہے۔ البتہ اگر اہل علم لوگ اپنے تئیں کوشش کریں تو کسی حد تک اس زخم کو مندھمل کرنے کی کوئی راہ نکل سکتی ہے۔ ان مسائل کو جاننے کے بعد اگر ان کے حل پہ غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں جن پہ عمل پیرا ہو کر ہم اس نزاع اور اختلاف سے بچ سکتے ہیں۔

ا۔ عربی زبان کی تعلیم کو عام کیا جائے تاکہ ہر خاص و عام میں اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی اہلیت تو پیدا کی جاسکے۔ جب ہماری اکثریت مفہوم کو از خود اخذ کرنے کے قابل ہو جائے گی تو اختلافات کم سے کم تر ہو جائیں گے۔ لیکن عربی پڑھانے کا مقصد یہ نہیں کہ محض ضرب، ضربا، ضربوا کی گردانیں یاد کرا دی جائیں بلکہ جدید خطوط پہ زبان کو سکھایا جائے۔ اسکولوں کی سطح پہ دینی تعلیمات کو عام کیا جائے تاکہ مسٹر اور ملا کا فرق ختم کیا جاسکے۔

۲۔ بنیادی مصطلحات کو عام فہم کیا جائے۔ پہلے اصول سمجھائے جائیں پھر فروع کو بیان کیا جائے۔ یعنی عوام الناس کو یہ بتایا جائے کہ فرض، واجب ایسے

احکامات ہیں جن پہ عمل کرنا نہایت ضروری ہے، اس طرح سنت مؤکدہ، اور سنت پہ عمل کرنے کا شریعت مطالبہ کرتی ہے لہٰذا ایسے کسی بھی عمل کو کرنے کا شریعت مطالبہ کر رہی ہے اور عامۃ الناس کو ان پہ عمل کرنا ہے۔ اس عمل کا فرض یا واجب ہونے پہ جو اختلاف ہے وہ علمی ہے اور وہ صرف علمی مجالس میں ہی زیر بحث آنا چاہیے نہ کہ عوامی مجالس میں۔ اسی طرح حرام، مکروہ تحریمی اور مکروہ وہ اعمال ہیں جن کے کرنے سے شریعت ہمیں روکتی ہے لہٰذا ان اعمال سے ہمیں باز رہنا چاہیے۔

۳۔ایسے بورڈ قائم کیے جائیں جو مدارس دینیہ کے لیے اختلافات سے مبرا نصاب تعلیم مرتب کریں۔ لیکن یہ لوگ افسر شاہی (بیوروکریٹ) کے ملازمیں نہیں ہونا چاہیں بلکہ تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماء کرام ہونا چاہیں۔ متفقہ نصاب میں صرف وہ مواد پڑھایا جائے جس پہ سب کا اتفاق ہو۔ اسی طرح مدارس میں اساتذہ بھی مختلف مسالک کے ہونا چاہییں اور طلبہ بھی۔اس سے ہم آہنگی کی فضاء قائم ہو گی ۔باہمی اختلاف کو کم سے کم درجے پہ لانے کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایک تجویز دی ہے وہ یہ کہ حدیث کی کتاب موطا امام مالک کو دینی مدارس میں رائج کیا جائے۔ اسکی حکمت یہ ہے کہ امام مالک استاد ہیں امام محمد بن حسن الشیبانی کے اور امام محمد خود امام ابوحنیفہ کے بھی شاگرد ہیں۔ اسی طرح امام شافعی بھی امام مالک کے شاگرد ہیں، امام احمد ابن حنبل امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ اس طرح امام مالک اہل

سنت والجماعت کے اکابرین کے استاد ہیں۔ اگر ان کی مرتب کردہ کتاب کو پڑھایا جائے گا تو تمام علماء کی تکریم بھی علماء اور طلبہ پہ لازم آئے گی اور ہم آہنگی و احترام کی فضا بھی قائم ہو گی۔ اسی طرح دوسرے مکتبۂ فکر کی کتب کو پڑھا لینے سے فضا میں موجود بغض و عناد کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اختلافات میں کمی رونما ہو سکتی ہے۔

۴۔ دینی درسگاہوں کو جدید علوم سے آراستہ کیا جائے۔ ان جدید علوم سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انہیں انگریزی کی لازمی تعلیم دی جائے بلکہ ان مدارس میں معاشیات اسلام، سیاسیات اسلام، ابن خلدون کے مقدمے کی روشنی میں عمرانیات، تاریخ، طب، (Islamize) ھندسہ اور ریاضی جیسے علوم پڑھائے جائیں جب ان علوم کو اسلامایا جائے گا تو عامۃ الناس کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھے گی کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو ہر شعبۂ زندگی کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ہر نظام کے مقابلے میں اس کے پاس بہترین نظام موجود ہے۔ اس طرح ہم دنیا کو باور کرا سکتے ہیں کہ ہر مشکل کا حل اسی دین مبین میں ہے۔

۵۔ فقہ اسلامی کی بلند ترین منزل اجتہاد ہے۔ اس منزل پہ پہنچ کر ایک مجتہد اپنی تمام تر ذہنی و علمی صلاحیتیں بروئے کار لا کر امت کے لیے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ بدلتے حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ شرعی حل تلاش کرتا ہے۔ علماء کرام کو خود بھی اور اپنے طلبہ کو بھی اس مقام تک پہنچانے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ اگر تمام مدارس مجتہدین بنانے کی کوشش کریں اور اس میں

مسابقت کا ماحول پیدا کریں تو یہ عین ممکن ہے کہ ہم مجتہدین پیدا نہ کر سکیں لیکن اس کوشش کے نتیجے میں کم از کم اعلیٰ پائے کے علماء تو پیدا ہو جائیں گے جو علوم کو اسلامانے (Islamization) میں کردار ادا کر سکیں گے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ قابل اور ذہین طلبہ کا انتخاب کر کے جید علماء کرام کی نگرانی میں دیا جائے۔ جب معاشرے کو بہترین ذہنی صلاحیتوں کے حامل علماء ملیں گے تو اختلافات میں نزاع کی صورتحال سے نکال سکیں گے۔

اگر گزشتہ بحث کا خلاصہ کیا جائے تو لب لباب یہ نکلتا ہے کہ دینی تعلیمات میں نہ تو اختلافات ہیں اور نہ ہی دینی تعلیمات باعث نزاع ہیں۔ دینی مراجع بھی متفق علیہ ہیں۔ اصل میں اختلاف ہماری نظر میں ہوتا ہے جب ملت کے افراد دینی تعلیمات پہ عمل کر رہے ہوں تب تک یہ اختلافات باعث برکت رہتا ہے۔ جوں ہی ہم بے عملی کو اختیار کرتے ہیں تو اختلافات جنم لیتے ہیں۔ نبی کا فرمان ہے کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک انہیں تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ ہیں قرآن اور میری سنت۔اگر امت مسلمہ کا ہر فرد دین کی تعلیمات کو سیکھنا اور اس پہ عمل کرنا شروع کر دے تو یہ مسلکی تنازعات حل ہو سکتے ہیں۔امت مسلمہ خود بھی امن و امان کے ثمر سے بہرہ ور ہو سکتی ہے اور دنیا کو بھی امن کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں دین کی تعلیمات پہ عمل پیرا ہونے کی

توفیق عطا فرمائے اور مسلکی نزاع سے امت مسلمہ کو نکال کر اتحاد و یگانگت کی فضا قائم ہو۔ آمین۔

متاع کارواں جاتا رہا

۱۰ جولائی ۲۰۱۵ کو ایک دردناک خبر نے آزاد کشمیر کی فضا کو سوگوار کر دیا تھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔ غازی آباد کے مقام پر عوام کے جم غفیر کے روبرو ایک جنازے کو عقیدت اور فوجی اعزاز سے جنازگاہ میں لایا گیا۔ فوج اور پولیس کے دستوں نے سلامی دی اور پاکستان کے قومی پرچم میں لپیٹ کر سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ جسد خاکی آزاد کشمیر کے سابق صدر و وزیراعظم مجاہد اول سردار محمد عبدالقیوم خان جیسی ہمہ پہلو شخصیت کا تھا جو ۹ دہائیوں پہ محیط ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد نیکیوں کے موسم بہار رمضان المبارک میں دارفانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
وہ ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

سردار صاحب کو اس قدر تکریم اور اعزاز کے ساتھ رخصت ہوتے دیکھ کر ذہن ماضی کے جھروکوں میں گم ہو گیا اور ۲۳ اگست ۱۹۴۷ کے دن کا تصوراتی منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ نیلہ بٹ کا مقام ہے دور دراز سے سفر کر کے آنے والے ہزاروں لوگ ایک جلسے کی صورت میں جمع ہیں اور کچھ بزرگ ان سے باری باری مخاطب ہو رہے

ہیں۔ اتنے میں ایک ۲۲ سالہ نوجوان ابھرتا ہے اور شیر کی طرح دھاڑتا ہے اس کی بات میں روانی ہے اس کے الفاظ میں کشش ہے وہ عالم دین نہیں لگتا مگر بات علم دین سے بھرپور ہے اس کی بات نے مجمع پہ سحر طاری کر دیا۔ وہ جہاد فی سبیل اللہ کا درس دیتا ہے اور ڈوگرا راج کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی دعوت دیتا ہے تمام سامعین اس کی تائید کرتے ہیں اور قران پاک پہ حلف لیتے ہیں کہ ڈوگرا حکومت سے اس وقت تک لڑیں گے جب تک وہ ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں کے حقوق حاصل نہ کر لیں اور ریاست کا الحاق پاکستان سے نہ کر لیں۔ یہ عقاب صفت نوجوان سردار عبدالقیوم خان تھا جو برطانوی فوج کی ملازمت کو خیر باد کہ کر اپنے آبائی علاقے محض اس لئے آیا تھا تاکہ مسلمانان ریاست کو پاکستان کے ساتھ ملانے کے لیے اپنا کردار ادا کر سکے۔

پاکستان اہل کشمیر کے لیے اس مقدس زمیں کی طرح ہے جو اللہ کی عبادت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے لیے وقف ہے اسکی حیثیت مسجد کی سی ہے۔ اس مسجد کے قیام کے لیے انہوں نے ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ میں وہ اذاں دی تھی جسکی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ سری نگر کی سنٹرل جیل کے سامنے آذاں دیتے ہوئے ۲۲ افراد نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ ان کی آذان کے الفاظ تو وہی تھے لیکن ان میں کچھ نئے معانی پوشیدہ تھے جو دلوں سے محسوس کیے جا سکتے تھے۔ جب وہ تکبیر کہہ رہے تھے تو گویا اعلان کر رہے تھے کہ اللہ کی زمین پہ اقتدار اعلیٰ کا حق صرف

اللہ کو حاصل ہے، جب وہ شہادتیں ادا در رہے تھے تو بیانگ دہل کہہ رہے تھے کہ اس سرزمیں پہ وہی نظام چلے کا جو اللہ کے رسول ﷺ کامل دین کی صورت میں ہم تک لائے ہیں، جب وہ حی علی الصلاۃ کہتے تو گویا پکار رہے ہوتے تھے کہ بندوں کی غلامی چھوڑ کر رب العباد کی بندگی اختیار کرو، جب حی علی الفلاح کی صدا بلند کرتے تو کہہ رہے ہوتے تھے کہ کامیابی تو اس چلن میں ہے جس کی جانب ہم پکارتے ہیں۔ ہم صدا لگاتے ہیں ہم تمہیں بلاتے ہیں آؤ ہمارے راستے پہ تم بھی کامیاب ہو جاؤگے۔اس مسجد کے قیام کے لیے دی جانے والی آذان کو مکمل کرتے ہوئے ۲۲ نوجوانوں کو شہید کر دیا گیا۔ پاکستان سے یہی عقیدت تھی جسکی وجہ سے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ کو مسلمانان جموں و کشمیر کی نمائندہ جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے الحاق پاکستان کی متفقہ قرارداد منظور کی۔

ڈوگرا سامراج کو یہ کہاں منظور تھا کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو۔ لہٰذا درون خانہ ہندوستان سے ساز باز ہونے لگا۔ اس ساز باز کی بو کو مسلمانان کشمیر نے محسوس کر لیا تھا اور حتمی فیصلہ کرنے کے لیے نیلہ بٹ آئے تھے۔ سردار صاحب کی ولولہ انگیز تقریر کے بعد بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ گنبد خضریٰ کی طرح سرسبز ریاست جموں و کشمیر کا الحاق کسی صورت کفر و شرک کے صحرا بھارت سے نہیں ہونے دیں گے۔ اللہ نے جو خطۂ ارض عطا کیا ہے اسے پاکستان جیسی مسجد کا حصہ ہی بنائیں گے۔اس اعلان نے ڈوگرا

سامراج کو ہلا کر رکھ دیا۔ بات چیت اور لالچ کے ذریعے اس تحریک کو ختم کرانے کی کوشش بھی کی گئی اور بزور طاقت کچلنے کی سعی لا حاصل بھی کی گئی۔ مسلح تصادم میں سردار صاحب نے ڈوگرا حکومت کے خلاف پہلی گولی چلائی۔

سردار صاحب اس مشن میں اکیلے نہ تھے گرد و نواح میں ان کے ہمنوا اور بھی تھے جو اس دور کی تاریکی میں جگنو بن کے ٹمٹمائے اور بعد ازاں وہ تحریک آزادیٔ کشمیر کے افق پہ چمکنے والے درخشندہ ستارے بن گئے۔ ان روشن ستاروں میں سردار فتح محمد کریلویؒ والد گرامی سردار سکندر حیات)، نائیک سیف علی خان جنجوعہ شہیدؒ (ہلال کشمیر ملٹری مساوی نشان حیدر) ، راجہ محمد حیدر خانؒ، بابائے پونچھ کرنل خان محمد خانؒ اور امیر شریعت مولانا عبداللہ کفلگڑھویؒ جیسی شخصیات شامل ہیں۔ ان افراد نے اپنے اپنے حلقوں میں افراد کو منظم کیا اور ڈوگرا فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس موقع پہ غازی ملت سردار محمد ابراہیمؒ خان نے ان مجاہدین کی سیاسی سرپرستی کی اور ان کی اقوام عالم کے سامنے بھرپور وکالت کی۔ مسلمان لشکر آگے بڑھتا گیا ڈوگرا فوج کو پسپا ہونے پہ مجبور کر دیا۔ مجاہدین کے پاس اسلحے کی کمی تھی لیکن اللہ تعالی نے اسے پورا کر دیا۔ بے کس مسلمانوں کی مدد کے لیے والیٔ سوات کی جانب سے مسلح لشکر امداد کے لیے روانہ کیے گئے جبکہ پنجاب کے سکاؤٹس نے بھی کشمیری مجاہدین کی مدد کے لیے کمر کس لی۔

مسلمانان ریاست جموں و کشمیر نے

اکتوبر ۱۹۴۷ کو آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کا اعلان کر کے مہاراجہ ہری سنگھ ۲۴ کو معزول کر دیا۔ مفرور مہاراجہ نے ہندوستان سے پناہ کے عوض الحاق کا معاہدہ کر لیا۔ ایک معزول و مفرور حکمران سے معاہدے کو بنیاد بنا کر ہندوستان کی فوجیں کشمیر میں در آئیں اور یہاں قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ ریاست کے مقبوضہ علاقوم میں رقص ابلیس بپا تھا ہر جانب لاشیں خون اور دھواں دکھتا تھا۔ ۶ نومبر ۱۹۴۷ کو صرف جموں شہر میں دو لاکھ سے زائد مسلمانوں کو پاکستان لے جانے کا جھانسہ دے کر گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔ ان کٹے بدنوں کی قبریں یا تو دریاؤں کی مچھلیاں بنیں یا جنگل کے درندے۔

ماضی کی خون آشام یادوں سے ناطہ توڑا تو حال میں پھر سردار صاحب کی آخری رسومات جاری تھیں۔تدفین کے بعد آبدیدہ جان نثاران گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے لیکن سب کے لبوں پہ کشمیر بنے گا پاکستان کے نعرے تھے۔ چھے دہائیوں سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی کشمیری عوام خود کو پاکستان کا حصہ بنانے کے لیے پر عزم ہیں، اسکے حصول کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں اور استقامت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ان کی خواہش ہے کہ جنت ارضی کو پاکستان کا حصہ بنایا جائے۔ قومی مواقع پہ وہ بھارتی برسریت کے سامنے سبز ہلالی پرچم لہراتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آرزو ہے کہ وہ پاکستان کی گھنی چھاؤں میں آ بیٹھیں

۔ شہداء کی لازوال قربانیاں جن کے نتیجے میں آج ہم آزاد و خود مختار مملکت میں بیٹھے ہیں ہم سے یہ سوال کر رہی ہیں کہ ہم تو دین پہ کٹ مرے تھے کیا ہمارے بعد تم نے ہمارے مشن کو تا پنی جان ،مال اور قویٰ کے ذریعے تقویت دی ؟، ہمارے حکمرانوں سے سوال کر رہی ہیں کہ ہمارے خون کو نظر انداز کرکے ہمارے ہی دشمنوں سے دوستی کی پینگیں چے معنی دارد؟ اور میڈیا کے اہلکاروں سے یہ سوال کر رہی ہیں کہ ہم تو دین پہ کٹ مرے آپ کو ہماری قربانی کے کس گوشے پہ شک ہے کہ اس تحریک کا رشتہ دین سے جوڑنے کے بجائے آج یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ یہ جدوجہد دینی تھی یا سیکولر؟ جس خطۂ ارضی کو مسجد بنانے کے لیے ہم نے آذان دی تھی جب پاکستان کی صورت میں وہ مسجد معرض وجود میں آ گئی تو قوم بحیثیت مجموعی رب کے آگے سر بسجود ہونے سے گریزاں کیوں ؟ چھوٹے بڑے ، امیر غریب ، کالے گورے اور ہر قسم کی معاشرتی تقسیم کو ختم کرکے ایک صف میں کھڑے ہونے کے بجائے صوبائیت ، علاقائیت اور فرقہ واریت کی بنیاد پہ انتشار کیوں؟ رب کی عطا کردہ زمیں پہ غیر اللہ کا نظام کیوں ؟اسلام کے نظام عدل ومساوات کے بجائے استبداد کا نظام ظلم کیوں؟ ہماری معیشت کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ (سود) پہ مبنی کیوں ہے ؟ہم نے صدائے حق پہ لبیک کہا ، اسکی خاطر قربانی دینے سے نہیں ٹلے اور نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر ایک امت ہونے کا عملی مظاہرہ کیا مگر مملکت خداداد میں اپنے ہی شہریوں ، اپنے ہی مسلم بھائیوں کو غیروں کے ہاتھ فروخت کرکے قومی خزانہ

بھرنے کی تجارت کیوں؟اپنے ہی ملک کے شہریوں پہ غیروں کے ہاتھوں بمباری اور اس پہ تفاخر کیوں ؟ غرض یہ قربانیاں ہمارے ضمیروں پہ مسلسل دستک دے رہی ہیں کہ خدا را ہمارا لہو بھلا نہ دینا۔خون شہیداں ہم سے تقاضا کر رہا ہے کہ ہمارے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بنا آرام سے نہ بیٹھ جانا۔ تحریک آزادی کو منطقی انجام تک پہنچائے بنا نہ چھوڑنا، کسی مصلحت پسندی کا شکار نہ ہو جانا۔اب یہ ہماری قومی ذمہ داری ہے کہ شہداء کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں اور جہد مسلسل کو اپنائیں۔ان شہدا نے مسجد کے قیام کے لیے قربانیاں دے دیں ہم کروٹ بدل کر خواب غفلت کا شکار نہ ہو جائیں بلکہ ہمیں آگے بڑھ کر اقوام عالم کی امامت کرنا چاہیے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو ذوق جہاد اور شوق شہادت سے سرشار کیا جائے اور انہیں ایک قوت کی صورت منظم کیا جائے اور اس نظام زندگی کے نفاذ کی عملی جدوجہد کی جائے۔اللہ تعالیٰ ہمیں شہداء کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔آمین۔

ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

محمد مسلم: عظیم انسان، بے باک صحافی

(20 ستمبر، یوم پیدائش پر خصوصی)

جاوید اختر

محمد مسلم صاحب ہندوستانی سماج کا بیش قیمت اثاثہ اور مسلم سماج کے کیسۂ زر کا آبدار موتی تھے۔ اعلیٰ اخلاق، تدبر، حکمت، فہم و دانش، دور بینی، دوراندیشی، تحمل وبردباری اور حق گوئی و بے باکی جیسی صفات ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ آزادی کے بعد اردو صحافت کا ایک بڑا اور معتبر نام ہیں۔ معروضیت، مقصدیت اور فنی صحافت کے آسماں کے وہ ایک درخشندہ ستارہ تھے۔ وہ اردو صحافت کی صرف آبرو ہی نہیں تھے بلکہ ملک کے ممتاز سنجیدہ رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے قیام اور آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کو مستحکم کرنے میں ان کا بڑا ہی اہم رول تھا۔ وہ جماعت اسلامی ہند کے اعلیٰ ترین فیصلہ ساز کمیٹی یعنی مجلس شوریٰ کے بھی رکن تھے۔

محمد مسلم صاحب 20 ستمبر 1920 کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا جب کہ والدہ کا انتقال اس سے نو ماہ پہلے ہی ہوچکا تھا۔ اس وقت بڑے بھائی غیور حسن صاحب کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ ان

دونوں بھائیوں کی پرورش ان کے نانا عبدالمتین صاحب ''متین'' نے کی، جو عربی، فارسی، انگریزی، ترکی اور سنسکرت کے ماہر اور سائنس و فلسفہ پر کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ عبدالمتین صاحب ریاست بھوپال میں تحصیلدار مقرر ہوئے بعد میں ترقی دے کر انہیں 'کامدار' بنایا گیا۔ 1908 میں جب وہ کلیا کھیڑا (بھوپال) کے تحصیلدار تھے، ان کی متعدد اہم ادبی شخصیات کے ساتھ خط وکتابت رہی۔ عبدالمتین صاحب نے یوسف قیصر کے ساتھ مل کر 'مالوہ ریویو' کے نام سے اردو کا ایک پندرہ روزہ بھی نکالا تھا۔ انہوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ ان کی وفات 20 اپریل 1938 کو بھوپال میں ہوئی۔ عبدالمتین صاحب کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نکاح مستقیم الدین ابن قمرالدین ابن مفتی یقین الدین کے ساتھ ہوا۔ جن سے دو بیٹے محمد غیور حسن اور محمد مسلم پیدا ہوئے۔ جب کہ دوسری بیٹی کا نکاح محمد شفیع سے ہوا' جن سے محمد شکیل پیدا ہوئے۔

محمد مسلم صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا جان سے حاصل کی۔ بعد میں مقامی اسکول میں داخل ہوئے۔ جہاں انہوں نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد باضابطہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن گھر پر عربی، فارسی اور انگریزی کی درس وتدریس کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور انہوں نے ان تینوں زبانوں پر دسترس حاصل کرلی۔ مسلم صاحب کی شادی 1950 میں تمیزہ بیگم کے ساتھ ہوئی۔ جن سے

گیارہ اولادیں (آٹھ بیٹے اور تین بیٹیاں) ہوئیں۔ان کے نام ہیں: ڈاکٹر اسلم عبداللہ، اسماء حبیب، امتہ المتین طیبہ، عبدالرحمٰن اکرم، اطہر مسلم، عبداللہ انور، عبداللہ احسن، عبداللہ خلیل، سیدہ اکبر حسین، مسعود اختر اور سعود ارحم۔ محمد مسلم صاحب کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی تعداد اس وقت 30 سے زائد ہے۔

محمد مسلم صاحب کے اجداد ریواڑی (ہریانہ) کے رہنے والے تھے۔ ریواڑی کے مفتی محلّہ میں ان کا آبائی مکان تھا۔ مسلم صاحب کا سلسلۂ نسب سالار مسعود غازی سے ملتا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی پاداش میں اس خاندان کے انیس افراد کو پھانسی دی گئی تھی۔ لیکن قمرالدین نام کے ایک نوعمر لڑکے کو اللہ نے (19) بچالیا جو کسی طرح چھپ چھپا کر بھوپال پہونچ گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یہی قمرالدین صاحب محمد مسلم صاحب کے دادا تھے۔ قمرالدین صاحب کے صاحب زادے مستقیم الدین صاحب نے محکمہ اکاونٹس میں ملازمت اختیار کی اور ساتھ ہی ساتھ اصلاحی اور رفاہی کاموں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ انہوں نے کئی انجمنیں قائم کیں جن میں انجمن امداد بیوگان و یتیمی اور بلاسودی قرضہ دینے والی ایک انجمن کی کارکردگی خاص طور پر نمایاں رہی ہیں۔ مستقیم صاحب کے دو صاحب زادے غیور حسن اور محمد مسلم تھے۔ کمزور و بے سہارا لوگوں کا سہارا بننے' لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے اور محبتوں کے کبھی نہ ختم

ہونے والے خزانے کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہنے کی جو تابندہ مثال مستقیم الدین صاحب نے ایک محدود حلقے میں قائم کی تھی، مسلم صاحب نے اس کا دائرہ پورے ملک تک وسیع کردیا۔ انہوں نے ایک ایک سانس اسلام کی سربلندی، مظلوموں کو انصاف دلانے، کمزوروں کا سہارا بننے اور حق و انصاف کی جدوجہد کے لئے وقف کردی اور یہی ان کی سب سے اہم شناخت قرار پائی۔ خاندانی پس منظر کی بنیاد پر یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ ایثار و قربانی اور حق کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادینے کی جو روایت محمد مسلم صاحب کو وراثت میں ملی تھی، انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ اس روایت کے نہ صرف حقیقی وارث تھے بلکہ اس کے بہترین امین و محافظ بھی تھے۔

محمد مسلم صاحب نے 1938 میں اخبار ''ندیم'' میں اعزازی سب ایڈیٹر کی حیثیت سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور کچھ ہی دنوں بعد خاکسار تحریک سے وابستہ ہوگئے اور آگے چل کر اس کے مغربی کمان کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ 1946 میں پہلی مرتبہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کئے گئے۔ مہینوں تک مقدمہ چلا جس کی پیروی انہوں نے خود کی اور سرکاری وکیل کا ناطقہ بند کردیا۔ عدالت نے انہیں باعزت بری کردیا۔ 1947 میں ندیم اخبار کے ایڈیٹر بن گئے۔ 1948 میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور چند مہینوں کے بعد رہا کردئے گئے۔ 1950 میں تین ماہ کے لئے ایک بار پھر نظر بند کئے گئے۔

محمد مسلم صاحب 1952 میں بھوپال سے دہلی آئے۔جماعت اسلامی ہند کے اولین امیر مولانا ابو اللیث اصلاحیؒ کی خواہش پر اکتوبر 1953 میں دعوت ہفت روزہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔جو اس وقت معروف صحافی اصغر علی عابدی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔اصغر علی عابدی صاحب کی سبکدوشی کے بعد 1956 میں دعوت کے باضابطہ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔اس سے ایک برس قبل 1955 سے ہی دعوت سہ روزہ شائع ہونے لگا تھا۔1960 میں اس کا روزنامہ ایڈیشن بھی شروع ہوا جب کہ 1979 سے ٹیبلائڈ کی شکل میں دعوت ہفت روزہ بھی نکلنے لگا۔1980 کی دہائی کے اوائل میں دماغ کے ٹیومر کا آپریشن ناکام ہوجانے کے بعد گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر مسلم صاحب 1982 میں دعوت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے۔ان کی سبکدوشی کے ساتھ ہی دعوت کا روزنامہ اور ہفت روزہ ایڈیشن بند ہوگیا۔دعوت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان پر پانچ مقدمات حکومت نے دائر کئے۔تین میں جرمانہ ہوا اور دو میں بری ہوئے۔1964 میں 13 دنوں تک تہاڑ جیل میں نظر بند کئے گئے۔1971 میں ہندو پاک کی جنگ کے دوران 42 دنوں تک جیل میں نظر بند کئے گئے جب کہ 1975 میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد دہلی اور انبالہ کی جیلوں میں 21 مہینے تک نظر بند رہے۔
محمد مسلم صاحب کا انتقال 3 جولائی 1986 کو پرانی دہلی میں کرائے کے ایک چھوٹے

سے مکان میں ہوا اور ان کی نماز جنازہ تاریخی جامع مسجد میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی نے پڑھائی۔ تدفین مہندیان کے تاریخی قبرستان میں ہوئی۔ جہاں شاہ عبدالرحیم اور ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے خانوادے نیز متعدد دیگر اہم شخصیات بشمول مسلم صاحب کے قریب ترین رفقاء ڈاکٹر سید محمود، مجاہد ملت مولانا فضل الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا افضل حسین دفن ہیں۔

مسلم صاحب اپنے دور کے ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ وہ صرف ایک صحافی یا اسلامی جماعت کے رہنما نہیں تھے بلکہ ان کی زندگی کے اتنے ڈھیر سارے پہلو ہیں جن سب پر اگر تھوڑی تھوڑی بھی روشنی ڈالی جائے تو اس کے لئے متعدد کتابیں درکار ہوں گی۔ محمد مسلم صاحب کی شخصیت ایک ایسے عبقری انسان کی حقیقی داستان ہے جس کی پوری زندگی حرکت و عمل سے عبارت تھی، جس کے قول و عمل میں کوئی فرق نہیں تھا، جو کلمہ حق ادا کرنے پر قید وبند کی صعوبتوں کے باوجود بھی ہمیشہ مسکراتا رہا، جس نے اپنے قلم کی حرمت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی، جس نے اپنے نظریات کا کبھی سودا نہیں کیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ صرف محمد مسلم صاحب ہی نہیں بلکہ ایسی نہ جانے کتنی قابل قدر ہستیاں گذری ہیں جن کی داستان حیات میں ہمارے لئے روشنی، رہنمائی اور تحریک کا بہت سامان ہے لیکن وقت کی دھول کے ساتھ ساتھ ان کے کارنامے، ان کی قربانیاں

ہماری نگاہوں سے معدوم اور ہمارے حافظے سے محو ہوتی جارہی ہیں۔ایسے لوگوں کی داستان حیات اگر مرتب نہیں کی گئی تو آنے والے دنوں میں یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہوجائے گا کہ ملک وملت کی بہتری کے لئے کن لوگوں نے طوفان و حوادث کا مقابلہ کرتے ہوئے حالات کارخ موڑا۔

اف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

(راقم الحروف کی زیر طبع کتاب ''محمد مسلم-- عظیم انسان ، بے باک صحافی'' کا ایک باب)

شہادت حسینؓ ایک سانحہ بھی، جادہ و منزل بھی

اقوام وامم کی زندگیوں میں سانحات نئے اسباق اور نئی راہیں لے کر آتے ہیں اور زندہ اقوام ان سانحات سے حاصل کردہ سبق سے اپنے لئے منزل اور نشان منزل کا تعین کرکے اپنی راہ متعین کرتی ہیں مگر افسوس کہ ہم ایسے ڈگر پہ رواں ہیں کہ مخصوص ایام کو کسی شخصیت یا واقعہ سے منسوب کرکے بڑے ہی جذبے اور عقیدت واحترام سے مناتے ہیں ایک نئے عزم کی تجدید کی جاتی ہے مگر دن گزرتے ہیں ماہ گزرتے ہیں اور گردش لیل و نہار ہمیں اگلے برس پھر اسی مقام پر لے آتی ہے اور ہم پرانے عہد کی تجدید کرتے رہ جاتے ہیں۔

ماضی کی طرح اس برس بھی محرم الحرام مذہبی عقیدت اور جذبے کے ساتھ منایا جا رہاہے۔10 محرم الحرام 63 ء ہجری کو پیش آنے والے واقعہ کربلا کی یاد میں تقاریب منعقد کی جارہی ہیں۔سیاسی، مذہبی، سماجی تعلیمی اور کاروباری حلقوں کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ذکرِ شہادتِ حسینؓ ہے۔مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے اپنے انداز میں آلِ رسول ﷺ سے اپنی عقیدت کا اظہار کررہے ہیں دراصل سانحہ کربلا اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے جس نے امت مسلمہ کو ایسا زخم لگایا ہے جو 14 صدیاں بیتنے کے باوجود تاحال رستا ہے

اوراس کی تکلیف آج بھی محسوس کی جاتی ہے۔ یہ اس لحاظ سے ایک بڑا المیہ ہے کہ نواسہ رسول ﷺ اور جگر گوشہ بتولؓ امام حسین ابن علیؓ کو اپنے مٹھی بھر رفقاء واہل بیت کے ہمراہ فرات کے کنارے پیاس سے تڑپایا گیا اور کیل کانٹے سے لیس فوج کے ہاتھوں بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ اگر یہ واقعہ کسی غیر مسلم حکومت یا فرد کی کارستانی ہوتی تو اس واقعے پر امت کو صبر آ جاتا لیکن اس زخم کی سنگینی اس لئے زیادہ ہے کہ یہاں زخم لگانے والی تیغ و سناں خود مسلمانوں ہی کی نیاموں سے نکلی تھیں اور واقعے کے ذمہ دار خود مسلمان حکمران تھے گویا۔

خنجر نے میرے میرا ہی جگر چاک کر دیا
تکلیف چارہ ساز □ زخمِ جگر گئی

اگر گہرائی سے اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے پیچھے ایک ہی مقصد کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو مخلوق خدا کی بندگیوں سے رہا کرا کے اللہ رب العباد کی بندگی میں دے دیا جائے، اسی لئے اسلام میں داخل ہوتے وقت ہر طاغوت کا انکار لازمی ہے اور جو کوئی بھی لاالہ الا اللہ کا اقرار کر لیتا ہے تو ہر طاغوت کا انکار کر دیتا ہے اور بندگی کا مستحق صرف رب العباد کو ہی قرار دیتا ہے اس اقرار کے بعد مخلوق خدا کی بندگی خواہ عبادت اصنام کی شکل میں ہو، عبادت نجم و قمر و شجر کی صورت میں ہو، ملک قوم برادری قبیلہ و رشتہ داری کے تقاضوں کی صورت میں ہو یا اپنی ہی

نفسانی خواہشات کی پیروی کے عفریت کی صورت میں ہو، کو پاؤں کی ٹھوکر سے اپنی راہ سے ہٹا دیتا ہے اور صرف اللہ رب العالمین کے احکامات کی پیروی کو مقصد حیات بنا لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس اقرار کے بعد بندگی کے قرینے بدل جاتے ہیں تفریق رنگ و نسل مٹ جاتی ہے، دوستی و دشمنی کا معیار بدل جاتا ہے، رشتے و ناطے کا معیار نسب و خون کے بجائے اس اقرار کا ماننا اور نہ ماننا قرار پاتا ہے، مال و دولت کے حصول کے لئے حلال و حرام کے معیارات قائم ہو جاتے ہیں ظلم و انصاف میں حد فاصل کھینچ لی جاتی ہے غرض لاالہ الا اللہ کا اقرار کر لینا محض ایک نعرہ یا ایک قول ہی نہیں رہتا بلکہ انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کو اللہ رب العزت کے احکام کا پابند بنا دینے کا ایک معاہدہ طے پاتا ہے جس کی پاسداری کے لئے اپنی راہ میں مزاحم کسی بھی رکاوٹ سے ٹکرانے سے گریز نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اپنی جان مال عزت اور اہل و عیال کے نقصان و قربانی کو خاطر میں لایا جاتا ہے۔

اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو اپنے ماننے والوں میں انقلاب پیدا کرتا ہے انہیں حوصلہ و ہمت عطا کرتا اور انہیں شجاعت کا درس دیتا ہے تاکہ وہ اپنی راہ میں آنے والے ہر طاغوت کا مقابلہ کر سکیں، دوسری طرف وہ شیطانی قوتیں جو انسان کو مخلوق خدا کی غلامی کا پابند کرتی ہیں اس انقلاب کے خلاف مزاحم ہو جاتی ہیں اور ترغیب و ترہیب کا ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے یہیں سے رزم

حق و باطل کا آغاز ہوتا ہے اوا ہل ایمان کے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔

1) پہلا راستہ یہ کہ طاغوت کے جبر و استعداد کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے، مصائب کو برداشت کیا جائے اور وقت آنے پر جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔

2) دوسرا راستہ اہل ایمان کے لئے یہ ہے کہ اگر وہ سمجھیں کہ اس معاشرے میں رہتے ہوئے حالات ایسے بنا دیئے گئے ہیں کہ اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونا محال ہو تو ایسی صورت میں اپنے مال و اسباب و عزیز و اقارب کو چھوڑ کر ایسے قطعہ ارض کی جانب سے ہجرت کر لی جائے جہاں احکام الٰہی پر کاربند رہنا آسان ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے مکہ میں کفار کے مظالم کے سامنے سینہ تانے رکھا اور استقامت کا مظاہرہ کیا پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی گئی کفار مکہ کی طرف سے مسلط کردہ جنگ میں جان و مال کا نذرانہ بھی پیش کیا اور مدینہ منورہ میں ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جس میں حاکم و محکوم کا فرق مٹا دیا گیا رنگ و نسل کا امتیاز ختم ہوا اور حقوق و فرائض، عدل و انصاف علم و عمل کے دروازے ہر خاص و عام پر کھول دیئے گئے مدینہ منورہ میں حاصل ہونے والی قوت اور غلبے کو دین کی سربلندی کے لئے بطور امانت خداوندی استعمال کیا گیا ہے حکومت کو ایک ذمہ داری تصور کیا گیا اور حکمران خدا اور مخلوق خدا کے سامنے جوابدہ ٹھہرا، درحقیقت اس معاشرے میں حکمران نہیں ہوتا

تھا بلکہ وہ ریاست کے اجتماعی امور کا نگران و ذمہ دار ہوتا تھا گویا رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جو نہ جغرافیائی حدود پر قائم تھی نہ رنگ و نسل کی کسی بنیاد پر بلکہ یہ ریاست قرآن و سنت کے وضع کردہ اصولوں پر قائم تھی جس کی ایک سمت اور ایک رخ متعین کر دیا گیا جس کا ہر فرد اور اور ریاست اجتماعی طور پر انسانت کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی میں دینے کے لئے سرگرم و کوشاں تھے۔

عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں کئی ہزار مربع میل کے علاقے پر پھیلی اسلامی حکومت نے بندگان خدا کو اللہ کے احکام کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں کیا ریاست کے انتظامی امور شوریٰ کے ذریعے طے کئے جاتے ہر شخص کسی بھی ذمہ دار پر بے لاگ تنقید کر سکتا تھا تنازعے کی صورت میں حکام خود عدالت میں فریق کی حیثیت سے حاضر ہوتے اور قاضی کے فیصلے کو دلی طور پر تسلیم بھی کیا جاتا، بیت المال کو امانت کے طور پر فلاح امت پر خرچ کیا جاتا اور اپنے ذاتی تصرفات میں استعمال نہ کیا جاتا کئی ہزار مربع میل پر حکمرانی کرنے والے خود کو قانون کا پابند سمجھتے اور قانون کی حکمرانی قائم رکھتے یہی وجہ ہے کہ حکمران عوام کے ہر مسئلے میں ان کے پاس موجود ہوتا ہے اور ان کے مسائل ان کی دہلیز پر حل ہوتے، خلفاء راتوں کو گشت کرکے عوام کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتے اور لوگوں کے مسائل حل کرتے، تنازعات میں ان کے فیصلے کرتے اور اگران

کے ساتھ کسی کا تنازعہ ہوتا تو عدالت میں بطور فریق حاضر ہوتے ۔ ریاست کا کوئی بھی فرد کسی بھی محفل میں سرعام انکا احتساب کر سکتا تھا۔

صد افسوس کہ خلافت راشدہ کے بعد یہ سلسلہ برقرار نہ رہ سکا اسکی وجہ یہ تھی کہ خلافت علی منہاج النبوۃ کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا اور یہ مقدس ادارہ ایک گروہ، قبیلے اور شخص کے ہاتھوں یرغمال ہو گیا۔ملوکیت کی ابتداء یزید کی تخت نشینی سے ہوئی جسے حضرت امیر معاؤیہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد ولی عہد نامزد کر دیا۔یزید عامۃالناس میں اچھی شہرت کا حامل نہیں تھا اور اسکا انتخاب شوری کے بجائے موروثی بنیادوں پر ہوا تھا یہ تخت نشینی دراصل اعلان تھا بنوامیہ کی حکومت کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس مقصد کو بھانپ لیا۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ ملوکیت کے قیام سے فردواحد کی حکمرانی کا قیام عمل میں آئے گا اور انسانیت ایک بار پھر انسانوں کے ہاتھوں غلام بن جائے گی ۔یزید کی تخت نشینی محض حکمران کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ اسکے نتیجے میں اسلام کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں ۔حضرات امام حسین رضی اللہ عنہ نے وقت کے اس جبر کے خلاف آواز بلند کی اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اصلاح احوال کی کوشش کی تاکہ جاہلیت جو مردہ ہو چکی تھی دوبارہ زندہ نہ ہونے پائے کیونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا اور مخلوق خدا کو جاہلیت سے نکالنے کی ذمہ داری علماء اور صالحین پر

عائد ہوتی ہے اس لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس طاغوت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بجائے اپنے مطالبات پیش کئے جو یہ ہیں۔(1) یزید کا انتخاب شورائی انداز میں ہو نہ کہ موروثی بنیاد پر، (2) فرد واحد کو ریاستی امور کے فیصلوں کا اختیار دینے کے بجائے نظام حکومت شورائی انداز میں چلایا جائے۔(3) ہر شخص کو حکومتی نظم و نسق پر بے لاگ تنقید کی آزادی دی جائے، (4) کوئی بھی شخص خدا اور مخلوق خدا کے سامنے جوابدہی سے بری الذمہ نہ ہو، (5) بیت المال کو ذاتی جاگیر بنانے کے بجائے امانت سمجھ کر استعمال کیا جائے، (6) شخصی حکومت کے بجائے قانون کی حکمرانی ہو، (7) تمام لوگوں کے لئے قانون کے نفاذ میں مکمل مساوات ہو۔

اگر مطالبات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان مطالبات کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی بلکہ حکومت کو اصولوں کی طرف دعوت دینا مقصود تھا۔ یہ مطالبات خالصتاً دینی غرض اور اصلاح احوال کے لئے پیش کئے گئے تھے۔اگر یزید اور اسکے مشیران ان مطالبات کو تسلیم کر لیتے تو امت مسلمہ خلافت علی منہاج النبوۃ کے ثمرات تادیر سمیٹتی اور یہ عظیم سانحہ رونما نہ ہوتا لیکن طاقت کے گھمنڈ میں آ کر حکومت وقت نے نہ صرف مطالبات کو ماننے سے انکار کیا بلکہ ترغیب و ترھیب کے اوچھے ہتھکنڈوں سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو دبانے کی کوشش کی اور بالآخر دریائے فرات کے کنارے بھوک اور پیاس کی حالت

میں آپؓ کو اپنے 72 ساتھیوں سمیت بے دردی سے شہید کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سانحہ کربلا نے جہاں ایک گہرے زخم کی صورت میں امت مسلمہ کو ایک صدمے سے دوچار کیا ہے وہیں امت کے مستقبل کے لئے جادہ و منزل بھی متعین کر دیا، اسلام کو نئی روح عطاء کی اور مسلمانان عالم کو سیاست، معاشرت، معیشت اور مذہب کے حوالے سے نئی راہ دکھائی۔ حضرت حسینؓ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قربانی دے کر بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لئے راستے کا تعین کر دیا اور اپنے پیچھے امت کے لئے وہ سبق چھوڑ گئے جو امت مسلمہ کے لئے جادہ و منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑا سبق جو ہمیں اس قربانی سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ظلم و جبر کا ارتکاب خواہ غیر مسلم کریں یا مسلم حکمران اسکے خلاف کمربستہ و صف آراء ہونا امت مسلمہ خصوصاً علماء کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ ثانیاً اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی بنیاد قرآن و سنت کی تعلیمات پر ہے مسلمان حکمران کی ہر روش کو اسلامی تعلیمات پر پرکھنا چاہئے۔ اگر وہ اس کے مطابق ہے تو قابل اتباع ہے ورنہ اصلاح کی کوشش کی جائے۔ ثالثاً اصلاح احوال کی کوشش دینی فریضہ سمجھ کر کرنا چاہئے نہ کہ اپنی کسی غرض و غایت اور مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے رابعاً اصلاح احوال سے باز رکھنے کے لئے عزت و مرتبے اور مال و دولت کی پیشکش بھی ہوتی ہے لیکن ایک مصلح کو کسی بھی قسم کی مفاہمت

نہیں کرنا چاہئے اور اجتماعی مفادات اور دینی تعلیمات کو اولیت دینا چاہئے۔ خامساً اصلاح احوال سے روکنے کے لئے مصائب و آلام سے بھی سامنا ہو سکتا ہے ان مصائب کا دلجمعی اور استقامت سے مقابلہ کرنا چاہئے اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے سادساً اصلاح احوال کی کوشش میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور کسی بھی ایسے اقدام سے گریز کرنا چاہئے جس کے نتیجے میں فساد برپا ہونے کا امکان ہو اور مسلمانوں کے گروہ آپس میں دست و گریباں ہو جائیں۔ کسی بھی صورت میں بے گناہ اور غیر متحارب افراد کو اذیت کا نشانہ نہ بنایا جائے نہ قتل کیا جائے دین کے غلبے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار نہ کی جائے جو شریعت اسلامیہ کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہو جیسے تکفیرِ مسلم، قتل مسلم، لوٹ گھسوٹ وغیرہ۔ سابعاً ہر صورت جنگ سے گریز کرنا چاہیے لیکن اگر یہی آخری چارہ ہو تو جان کی پرواہ کئے بغیر اس راہ سے گزر جانا چاہئے۔ثامناً امت کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر اس قوت کا ساتھ دے جو حق کی علمبردار ہو اور ایسی صورتحال میں خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے۔لیکن کسی ایسی تحریک کا حصہ نہ بنا جائے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ دشمن اسلام کو فائدہ پہنچتا ہو اور مجموعی طور پہ ملت اسلامیہ کا نقصان ہوتا ہو۔ دانستہ یا نادانستہ دشمن کا آل□ ہٰکار نہیں بننا چاہیے۔

اگر ہم امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال کا موازنہ سانحہ کربلا کی صورت حال سے کریں تو یہ بات عیاں ہے کہ امت مسلمہ سے وابستہ ہر ملک میں ایسے حکمران مسلط ہیں جو امت مسلمہ کے اجتماعی مزاج کے خلاف اس امت کی تقدیر کو ہانک رہے ہیں کہیں فوجی کہیں سول اور کہیں جمہوری آمریت کے ذریعے اقتدار اعلیٰ پر قابض ان حکمرانوں نے امت کو رنگ و نسل زبان و وطن کی لکیروں سے تقسیم کر رکھا ہے۔اصلاح احوال کے حوالے سے کی جانے والی کسی بھی کوشش کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو لشکر حسینی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ان حالات کی نزاکت امت مسلمہ کے ہر مصلح کو دعوت دے رہی ہے کہ حضرت حسینؓ کے اسوہ کو اپناتے ہوئے یزیدیت جدیدہ کے ہر چیلنج کو قبول کیا جائے اور رسم شبیری ادا کرتے ہوئے امت مسلمہ کو درپیش مصائب سے نجات دلائی جائے۔ یہ حالات اسلامی ممالک میں بسنے والے ہر فرد سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ اسوہ حسینی کی پیکر تحریکات کا ساتھ دیا جائے اور محض تماشائی کا کردار ادا نہ کیا جائے۔ اگر امت مسلمہ کے علماء، سیاست دان اور عام افراد اسوہ حسینی پر عمل پیرا ہو کر جبر واستداد کا مقابلہ کریں تو امت مسلمہ اس بحران سے نکل سکتی ہے اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے ثمرات اس دور میں بھی سمیٹے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالی امت مسلمہ کو ان کے اصل مقصد سے آشنا کرکے اسکے حصول میں کامیاب کرے۔آمین

شہادت حسینؓ، ایک سانحہ بھی، جادہ و منزل بھی

اقوام وامم کی زندگیوں میں سانحات نئے اسباق اور نئی راہیں لے کر آتے ہیں اور زندہ اقوام ان سانحات سے حاصل کردہ سبق سے اپنے لئے منزل اور نشان منزل کا تعین کرکے اپنی راہ متعین کرتی ہیں مگر افسوس کہ ہم ایسے ڈگر پہ رواں ہیں کہ مخصوص ایام کو کسی شخصیت یا واقعہ سے منسوب کرکے بڑے ہی جذبے اور عقیدت واحترام سے مناتے ہیں ایک نئے عزم کی تجدید کی جاتی ہے مگر دن گزرتے ہیں ماہ گزرتے ہیں اور گردش لیل و نہار ہمیں اگلے برس پھر اسی مقام پر لے آتی ہے اور ہم پرانے عہد کی تجدید کرتے رہ جاتے ہیں

ماضی کی طرح اس برس بھی محرم الحرام مذہبی عقیدت اور جذبے کے ساتھ منایا جا رہاہے۔10 محرم الحرام 63 ء ہجری کو پیش آنے والے واقعہ کربلا کی یاد میں تقاریب منعقد کی جارہی ہیں۔سیاسی، مذہبی، سماجی تعلیمی اور کاروباری حلقوں کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ذکرِ شہادتِ حسینؓ ہے۔مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے اپنے انداز میں آلِ رسول ﷺ سے اپنی عقیدت کا اظہار کررہے ہیں دراصل سانحہ کربلا اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے جس نے امت مسلمہ کو ایسا زخم لگایا ہے جو 14 صدیاں بیتنے کے باوجود تاحال رستا ہے

اوراس کی تکلیف آج بھی محسوس کی جاتی ہے۔ یہ اس لحاظ سے ایک بڑا المیہ ہے کہ نواسہ رسول ﷺ اور جگر گوشہ بتولؓ امام حسین ابن علیؓ کو اپنے مٹھی بھر رفقاء واہل بیت کے ہمراہ فرات کے کنارے پیاس سے تڑپایا گیا اور کیل کانٹے سے لیس فوج کے ہاتھوں بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ اگر یہ واقعہ کسی غیر مسلم حکومت یا فرد کی کارستانی ہوتی تو اس واقعے پر امت کو صبر آ جاتا لیکن اس زخم کی سنگینی اس لئے زیادہ ہے کہ یہاں زخم لگانے والی تیغ و سناں خود مسلمانوں ہی کی نیاموں سے نکلی تھیں اور واقعے کے ذمہ دار خود مسلمان حکمران تھے گویا۔

خنجر نے میرے میرا ہی جگر چاک کر دیا
تکلیف چارہ سازیٔ زخمِ جگر گئی

اگر گہرائی سے اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے پیچھے ایک ہی مقصد کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو مخلوق خدا کی بندگیوں سے رہا کرا کے اللہ رب العباد کی بندگی میں دے دیا جائے، اسی لئے اسلام میں داخل ہوتے وقت ہر طاغوت کا انکار لازمی ہے اور جو کوئی بھی لاالہ الا اللہ کا اقرار کر لیتا ہے تو ہر طاغوت کا انکار کر دیتا ہے اور بندگی کا مستحق صرف رب العباد کو ہی قرار دیتا ہے اس اقرار کے بعد مخلوق خدا کی بندگی خواہ عبادت اصنام کی شکل میں ہو، عبادت نجم و قمر و شجر کی صورت میں

ہو، ملک قوم برادری قبیلہ و رشتہ داری کے تقاضوں کی صورت میں ہو یا اپنی ہی نفسانی خواہشات کی پیروی کے عفریت کی صورت میں ہو، کو پاؤں کی ٹھوکر سے اپنی راہ سے ہٹا دیتا ہے اور صرف اللہ رب العالمین کے احکامات کی پیروی کو مقصد حیات بنا لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس اقرار کے بعد بندگی کے قرینے بدل جاتے ہیں تفریق رنگ و نسل مٹ جاتی ہے، دوستی و دشمنی کا معیار بدل جاتا ہے، رشتے و ناطے کا معیار نسب و خون کے بجائے اس اقرار کا ماننا اور نہ ماننا قرار پاتا ہے، مال و دولت کے حصول کے لئے حلال و حرام کے معیارات قائم ہو جاتے ہیں ظلم و انصاف میں حد فاصل کھینچ لی جاتی ہے غرض لاالہ الا اللہ کا اقرار کر لینا محض ایک نعرہ یا ایک قول ہی نہیں رہتا بلکہ انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کو اللہ رب العزت کے احکام کا پابند بنا دینے کا ایک معاہدہ طے پاتا ہے جس کی پاسداری کے لئے اپنی راہ میں مزاحم کسی بھی رکاوٹ سے ٹکرانے سے گریز نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اپنی جان مال عزت اور اہل و عیال کے نقصان و قربانی کو خاطر میں لایا جاتا ہے۔

اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو اپنے ماننے والوں میں انقلاب پیدا کرتا ہے انہیں حوصلہ و ہمت عطا کرتا اور انہیں شجاعت کا درس دیتا ہے تاکہ وہ اپنی راہ میں آنے والے ہر طاغوت کا مقابلہ کر سکیں، دوسری طرف وہ شیطانی قوتیں جو انسان کو مخلوق خدا کی غلامی کا پابند کرتی ہیں اس انقلاب کے خلاف مزاحم

ہو جاتی ہیں اور ترغیب و ترہیب کا ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے یہیں سے رزم حق و باطل کا آغاز ہوتا ہے اوا ہل ایمان کے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔

1) پہلا راستہ یہ کہ طاغوت کے جبر و استعداد کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے، مصائب کو برداشت کیا جائے اور وقت آنے پر جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔

2) دوسرا راستہ اہل ایمان کے لئے یہ ہے کہ اگر وہ سمجھیں کہ اس معاشرے میں رہتے ہوئے حالات ایسے بنا دیئے گئے ہیں کہ اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونا محال ہو تو ایسی صورت میں اپنے مال و اسباب و عزیز و اقارب کو چھوڑ کر ایسے قطعہ ارض کی جانب سے ہجرت کر لی جائے جہاں احکام الٰہی پر کاربند رہنا آسان ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے مکہ میں کفار کے مظالم کے سامنے سینہ تانے رکھا اور استقامت کا مظاہرہ کیا پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی گئی کفار مکہ کی طرف سے مسلط کردہ جنگ میں جان و مال کا نذرانہ بھی پیش کیا اور مدینہ منورہ میں ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جس میں حاکم و محکوم کا فرق مٹا دیا گیا رنگ و نسل کا امتیاز ختم ہوا اور حقوق و فرائض، عدل و انصاف علم و عمل کے دروازے ہر خاص و عام پر کھول دیئے گئے مدینہ منورہ میں حاصل ہونے والی قوت اور غلبے کو دین کی سربلندی کے لئے بطور امانت خداوندی

استعمال کیا گیا ہے حکومت کو ایک ذمہ داری تصور کیا گیا اور حکمران خدا اور مخلوق خدا کے سامنے جوابدہ ٹھہرا، درحقیقت اس معاشرے میں حکمران نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ریاست کے اجتماعی امور کا نگران و ذمہ دار ہوتا تھا گویا رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جو نہ جغرافیائی حدود پر قائم تھی نہ رنگ و نسل کی کسی بنیاد پر بلکہ یہ ریاست قرآن و سنت کے وضع کردہ اصولوں پر قائم تھی جس کی ایک سمت اور ایک رخ متعین کر دیا گیا جس کا ہر فرد اور اور ریاست اجتماعی طور پر انسانیت کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی میں دینے کے لئے سرگرم و کوشاں تھے۔

عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں کئی ہزار مربع میل کے علاقے پر پھیلی اسلامی حکومت نے بندگان خدا کو اللہ کے احکام کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں کیا ریاست کے انتظامی امور شوریٰ کے ذریعے طے کئے جاتے ہر شخص کسی بھی ذمہ دار پر بے لاگ تنقید کر سکتا تھا تنازعے کی صورت میں حکام خود عدالت میں فریق کی حیثیت سے حاضر ہوتے اور قاضی کے فیصلے کو دلی طور پر تسلیم بھی کیا جاتا، بیت المال کو امانت کے طور پر فلاح امت پر خرچ کیا جاتا اور اپنے ذاتی تصرفات میں استعمال نہ کیا جاتا کئی ہزار مربع میل پر حکمرانی کرنے والے خود کو قانون کا پابند سمجھتے اور قانون کی حکمرانی قائم رکھتے یہی وجہ ہے کہ حکمران عوام کے ہر مسئلے میں ان کے پاس موجود ہوتا ہے اور ان کے مسائل ان

کی دہلیز پر حل ہوتے، خلفاء راتوں کو گشت کرکے عوام کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتے اور لوگوں کے مسائل حل کرتے، تنازعات میں ان کے فیصلے کرتے اور اگر ان کے ساتھ کسی کا تنازعہ ہوتا تو عدالت میں بطور فریق حاضر ہوتے۔ ریاست کا کوئی بھی فرد کسی بھی محفل میں سرعام انکا احتساب کر سکتا تھا۔

صدافسوس کہ خلافت راشدہ کے بعد یہ سلسلہ برقرار نہ رہ سکا اسکی وجہ یہ تھی کہ خلافت علی منہاج النبوۃ کو ملوکیت میں تبدیل کر دیاگیا اور یہ مقدس ادارہ ایک گروہ، قبیلے اور شخص کے ہاتھوں یرغمال ہو گیا۔ملوکیت کی ابتداء یزید کی تخت نشینی سے ہوئی جسے حضرت امیر معاؤیہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد ولی عہد نامزد کر دیا۔یزید عامۃالناس میں اچھی شہرت کا حامل نہیں تھا اور اسکا انتخاب شوری کے بجائے موروثی بنیادوں پر ہوا تھا یہ تخت نشینی دراصل اعلان تھا بنوامیہ کی حکومت کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس مقصد کو بھانپ لیا۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ ملوکیت کے قیام سے فردواحد کی حکمرانی کا قیام عمل میں آئے گا اور انسانیت ایک بار پھر انسانوں کے ہاتھوں غلام بن جائے گی۔یزید کی تخت نشینی محض حکمران کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ اسکے نتیجے میں اسلام کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔حضرات امام حسین رضی اللہ عنہ نے وقت کے اس جبر کے خلاف آواز بلند کی اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اصلاح احوال کی کوشش کی تاکہ جاہلیت جو

مردہ ہو چکی تھی دوبارہ زندہ نہ ہونے پائے کیونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا اور مخلوق خدا کو جاہلیت سے نکالنے کی ذمہ داری علماء اور صالحین پر عائد ہوتی ہے اس لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس طاغوت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بجائے اپنے مطالبات پیش کئے جو یہ ہیں۔(1) یزید کا انتخاب شورائی انداز میں ہو نہ کہ موروثی بنیاد پر، (2) فرد واحد کو ریاستی امور کے فیصلوں کا اختیار دینے کے بجائے نظام حکومت شورائی انداز میں چلایا جائے۔(3) ہر شخص کو حکومتی نظم و نسق پر بے لاگ تنقید کی آزادی دی جائے، (4) کوئی بھی شخص خدا اور مخلوق خدا کے سامنے جوابدہی سے بری الذمہ نہ ہو، (5) بیت المال کو ذاتی جاگیر بنانے کے بجائے امانت سمجھ کر استعمال کیا جائے، (6) شخصی حکومت کے بجائے قانون کی حکمرانی ہو، (7) تمام لوگوں کے لئے قانون کے نفاذ میں مکمل مساوات ہو۔

اگر مطالبات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان مطالبات کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی بلکہ حکومت کو اصولوں کی طرف دعوت دینا مقصود تھا۔ یہ مطالبات خالصتاً دینی غرض اور اصلاح احوال کے لئے پیش کئے گئے تھے۔ اگر یزید اور اسکے مشیران ان مطالبات کو تسلیم کر لیتے تو امت مسلمہ خلافت علی منہاج النبوۃ کے ثمرات تادیر سمیٹتی اور یہ عظیم سانحہ رونما نہ ہوتا لیکن طاقت کے گھمنڈ میں آ کر حکومت وقت نے نہ صرف مطالبات کو ماننے سے انکار کیا

بلکہ ترغیب و ترھیب کے اوچھے ہتھکنڈوں سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو دبانے کی کوشش کی اور باآخر دریائے فرات کے کنارے بھوک اور پیاس کی حالت میں آپؓ کو اپنے 72 ساتھیوں سمیت بے دردی سے شہید کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سانحہ کربلا نے جہاں ایک گہرے زخم کی صورت میں امت مسلمہ کو ایک صدمے سے دوچار کیا ہے وہیں امت کے مستقبل کے لئے جادہ و منزل بھی متعین کر دیا، اسلام کو نئی روح عطاء کی اور مسلمانان عالم کو سیاست، معاشرت، معیشت اور مذہب کے حوالے سے نئی راہ دکھائی۔ حضرت حسینؓ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قربانی دے کر بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لئے راستے کا تعین کر دیا اور اپنے پیچھے امت کے لئے وہ سبق چھوڑ گئے جو امت مسلمہ کے لئے جادہ و منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑا سبق جو ہمیں اس قربانی سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ظلم و جبر کا ارتکاب خواہ غیر مسلم کریں یا مسلم حکمران اسکے خلاف کمربستہ و صف آراء ہونا امت مسلمہ خصوصاً علماء کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ ثانیاً اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی بنیاد قرآن و سنت کی تعلیمات پر ہے مسلمان حکمران کی ہر روش کو اسلامی تعلیمات پر پرکھنا چاہئے۔ اگر وہ اس کے مطابق ہے تو قابل اتباع ہے ورنہ اصلاح کی کوشش کی جائے۔ ثالثاً اصلاح احوال کی کوشش دینی فریضہ سمجھ کر کرنا چاہئے نہ کہ اپنی کسی غرض و غایت اور مفاد کو

سامنے رکھتے ہوئے رابعاً اصلاح احوال سے باز رکھنے کے لئے عزت و مرتبے اور مال و دولت کی پیشکش بھی ہوتی ہے لیکن ایک مصلح کو کسی بھی قسم کی مفاہمت نہیں کرنا چاہئے اور اجتماعی مفادات اور دینی تعلیمات کو اولیت دینا چاہئے ۔ خامساً اصلاح احوال سے روکنے کے لئے مصائب و آلام سے بھی سامنا ہو سکتا ہے ان مصائب کا دلجمعی اور استقامت سے مقابلہ کرنا چاہئے اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے سادساً اصلاح احوال کی کوشش میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور کسی بھی ایسے اقدام سے گریز کرنا چاہئے جس کے نتیجے میں فساد برپا ہونے کا امکان ہو اور مسلمانوں کے گروہ آپس میں دست و گریباں ہو جائیں ۔ کسی بھی صورت میں بے گناہ اور غیر متحارب افراد کہ اذیت کا نشانہ نہ بنایا جائے نہ قتل کیا جائے دین کے غلبے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار نہ کی جائے جو شریعت اسلامیہ کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہو جیسے تکفیرِ مسلم ، قتل مسلم ، لوٹ گھسوٹ وغیرہ ۔ سابعاً ہر صورت جنگ سے گریز کرنا چاہیے لیکن اگر یہی آخری چارہ ہو تو جان کی پرواہ کئے بغیر اس راہ سے گزر جانا چاہئے ۔ثامنا امت کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر اس قوت کا ساتھ دے جو حق کی علمبردار ہو اور ایسی صورتحال میں خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے ۔ لیکن کسی ایسی تحریک کا حصہ نہ بنا جائے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ دشمنِ اسلام کو فائدہ پہنچتا ہو اور مجموعی طور پہ ملت اسلامیہ کا نقصان ہوتا ہو ۔ دانستہ یا نادانستہ دشمن کا

آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔

اگر ہم امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال کا موازہ سانحہ کربلا کی صورت حال سے کریں تو یہ بات عیاں ہے کہ امت مسلمہ سے وابستہ ہر ملک میں ایسے حکمران مسلط ہیں جو امت مسلمہ کے اجتماعی مزاج کے خلاف اس امت کی تقدیر کو ہانک رہے ہیں کہیں فوجی کہیں سول اور کہیں جمہوری آمریت کے ذریعے اقتدار اعلیٰ پر قابض ان حکمرانوں نے امت کو رنگ و نسل زبان و وطن کی لکیروں سے تقسیم کر رکھا ہے۔اصلاح احوال کے حوالے سے کی جانے والی کسی بھی کوشش کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو لشکر حسینی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ان حالات کی نزاکت امت مسلمہ کے ہر مصلح کو دعوت دے رہی ہے کہ حضرت حسینؓ کے اسوہ کو اپناتے ہوئے۔یزیدیت جدیدہ کے ہر چیلنج کو قبول کیا جائے اور رسم شبیری ادا کرتے ہوئے امت مسلمہ کو درپیش مصائب سے نجات دلائی جائے۔

یہ حالات اسلامی ممالک میں بسنے والے ہر فرد سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ اسوہ حسینی کی پیکر تحریکات کا ساتھ دیا جائے اور محض تماشائی کا کردار ادا نہ کیا جائے۔اگر امت مسلمہ کے علماء، سیاست دان اور عام افراد اسوہ حسینی پر عمل پیرا ہو کر جبر واستداد کا مقابلہ کریں تو امت مسلمہ اس بحران سے نکل سکتی ہے اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے ثمرات اس دور میں بھی سمیٹے جا سکتے ہیں۔اللہ تعالی امت مسلمہ کو ان کے اصل مقصد سے آشنا کرکے اسکے حصول میں کامیاب

کرے۔آمین

میرا قلم لہو لہو۔۔۔۔۔۔ میری زباں لہو لہو

جموں کی داستانِ خونچکاں

(6 نومبر۔۔۔یوم شہدائے جموں کے حوالے سے خصوصی تحریر)

اس روز سورج غروب ہوا تو فضاء میں ہولناک خاموشی طاری تھی پرندوں کے چہچہوں کو بھی گویا چپ لگ گئی تھی۔ اس خاموشی کو اگر کوئی چیز توڑتی تھی تو صرف مردار خور درندوں، گِدھ اور الّو کی خونخوار آوازیں تھیں جو آج انسانی گوشت سے شکم بھرنے کے لیے بیتاب تھے۔ان خوفناک آوازوں کو سننے والے چند ہی کان تھے اور دیکھنے کے لیے چند ہی آنکھیں، باقی شہر تو شہر خموشاں بن چکا تھا، ہر بستی ویران تھی اور ہر گھر لٹا پٹا تھا۔ ہر سمت جلے ہوئے گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور گرد آلود فضاء پہ وحشت کا راج۔یہ 6 نومبر 1947 کے دن جموں شہر کا منظر تھا جسے مسلمانان جموں و کشمیر یوم شہدائے جموں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔اس شہر پہ یہ قیامت نہ کسی زلزلے نے ڈھائی تھی نہ کسی طوفان بادوباراں نے، نہ سیلاب کی موجوں نے اسے تاراج کیا نہ ہی آسمان سے بجلیاں گریں۔ یہ سب ریاست جموں و کشمیر کے غاصب ڈوگرا حکمرانوں کے نسلی و مذہبی تعصب کا شاخسانہ تھا۔ ڈوگرا سامراج یہ جان چکا تھا کہ وہ مسلم اکثریت پہ اپنا حق حکمرانی کھو چکا ہے تو اس نے اس اکثریت کو اقلیت

میں بدلنے کے لیے ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت موت کا یہ ہولناک کھیل کھیلا۔ لاکھوں مسلمانان جموں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔ کسی شاعر نے کہا

سڑکیں زہر آلود نگر ویران ہوئے
ایسا پھیلا خوف کہ دل سنسان ہوئے
آدم خور درندے فارغ بیٹھ گئے
جب سے وحشت پہ مائل انسان ہوئے

جموں میں انسانی نسل کشی کا یہ دلدوز واقعہ انسانی تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے۔ Genocide اس سے قبل بھی تاریخ نے انسانی نسل کشی کے دہشت ناک مناظر دیکھ رکھے تھے۔ ان میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی، صلیبی لشکروں کے ہاتھوں بیت المقدس میں قتل عام، بعد ازاں یورپی نوآبادیاتی تسلط کے ہاتھوں مسلم دنیا میں قتل عام اور بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی کے واقعات تاریخ کا حصہ ہیں۔ گزشتہ صدی کو عالمی دنیا Holocaust میں نازیوں کے ہاتھوں ہونے والی یہودیوں کی نسل کشی نے بہت یاد کیا اور اب تک اسے انسانی تاریخ کا ظلم عظیم قرار دیا جاتا ہے اسی کو بنیاد بنا کر فلسطین میں یہودیوں کو اسرائیل کے نام سے الگ ملک کے قیام میں نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ بھرپور تعاون بھی کیا گیا اور مقامی فلسطینیوں کو ان کے ملک سے نکال

کر در بدر کر دیا گیا۔ لیکن یہ سب واقعات تو اس سرزمین پہ ہوئے جسے مغرب کہتے ہیں۔ جہاں اقدار، تہذیب اور تمدن کبھی ڈھونڈنے کو نہیں ملتے تھے لیکن جموں کا قتل عام اس حوالے سے منفرد ہے کہ یہ مشرق میں تہذیب و تمدن کے گہوارے میں ہوا اور پھر کشمیر جیسی پر امن ریاست میں ہوا جس کے باسی جنگ و جدل سے کوسوں دور تھے۔

ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرا راج نے اس سے قبل بھی ہندو عصبیت کا گھناونا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ریاست کی اکثریت مسلمان تھی لیکن مسلم آبادی کو دوسرے درجے کے شہری کا درجہ دیا گیا تھا۔ ہندو اقلیت کو کاروبارِ حکومت میں شریک کیا گیا تھا۔ فوج، پولیس اور دیگر محکمہ جات کے کلیدی عہدے ہندوؤں کو عنایت کیے گئے تھے۔ ریاستی قوانین بھی ایسے بنائے گئے تھے جو مسلم آبادی کا سراسر استحصال کر رہے تھے۔ ڈوگرا حکومت نے مسلم اکثریت کا معاشی، معاشرتی اور سیاسی استحصال کر کے اس قابل بھی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اپنے حق کی بات تک کر سکیں۔ جب جون 1947 میں تقسیم ہند کا اصولی فیصلہ ہوا تو ڈوگرا حکومت کو اپنا راج ہوا میں تحلیل ہوتے دکھائی دیا۔ تقسیم کے اصولوں کے تحت مسلم اکثریت کی ریاستوں کو ان کی آبادی کی رائے کے مطابق پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی کا انتخاب کرنا تھا۔ ریاست کی غالب اکثریت مسلم تھی اس لیے کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق فطری تھا اور اس پہ مستزاد

مسلمانانِ جموں و کشمیر کی نمائندہ جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرس نے 19 جولائی 1947 کو قرارداد الحاق پاکستان منظور کر ڈالی۔ دوسری جانب ڈوگرا مہاراجہ ہری سنگھ بھارت سے الحاق کا خواہاں تھا لیکن اسکے خوابوں کی تعبیر میں مسلم اکثریت حائل تھی۔ اس مسئلے کا حل یہ تھا کہ مسلم اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا جائے جو کہ راتوں رات ممکن نہ تھا اس لیے اس نے قیام پاکستان کے ساتھ ہی حکومت پاکستان کے ساتھ معاہدۂ قائمہ کر لیا تاکہ اسے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مہلت مل سکے۔ مہاراجہ نے بھارت سے انتہا پسند ہندوؤں کو جموں بلوایا اور مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کے تحت مسلمانوں کی بڑی تعداد کا قتل عام کیا جانا تھا اس طرح صوبہ جموں مسلم اکثریت سے محروم ہو جاتا اور باقی ریاست کے مسلمان سہم کر ڈوگرا استبداد کو قبول کر لیتے یا ریاست چھوڑ کر بھاگ جاتے۔

مہاراجہ کشمیر نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلم آبادی کو غیر مسلح کرنا شروع کیا۔ پھر اگست کے مہینے سے مسلمانوں کے قتل عام کا آغاز کر دیا گیا۔ پونچھ اور گلگت بلتستان کے عوام نے مہاراجہ کے مکروہ عزائم کو بھانپ لیا اور اپنے میسرہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے مہاراجہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ ان مسلمانوں کی امداد کے لیے ریاست سوات سے قبائلی لشکر بھی

پہنچ گئے۔ مجاہدین کشمیر ڈوگروں کے دانت کھٹے کرتے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ اکتوبر 1947 کو آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان 24 نے مہاراجہ کو معزول کر دیا اور وہ مفرور ہو کر جموں پہنچا۔ جموں پہنچ کر اس نے بھارت سے فوجی امداد طلب کی اس موقع کو بھارت نے غنیمت جانا اور مہاراجہ کی امداد کو بھارت سے الحاق کے ساتھ مشروط کر دیا۔ ایک معزول و مفرور حکمران کی حیثیت سے اس نے زبانی الحاق کا معاہدہ کر لیا جس کی رو سے بھارتی افواج کشمیر میں در آئیں۔ اس معاہدے کو زبانی کہنے کی توجیہ یہ ہے کہ بھارت نے کبھی بھی اس معاہدے کی دستاویز پیش نہیں کی۔ بہر حال جموں میں پہلے سے موجود ڈوگرہ فوج، ہندو بلوائیوں اور بھارتی فوج نے مل کر مسلمانوں کی نسل کشی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔

اس مذموم اقدام کے لیے ایک منظم منصوبہ بندی کی گئی۔ پہلے مسلم کش فسادات کا آغاز کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے درمیان عدم تحفظ کی فضاء قائم کر دی جائے۔ ڈوگرہ حکومت اور بھارتی افواج ہندو انتہا پسندوں کی کاروائیوں کو روکنے میں بے بس نظر آتے یہاں تک کہ جو مسلمان بھی پناہ کی تلاش میں ریاستی اداروں تک گیا انہیں پولیس اور ڈوگرا فوجی خود انتہا پسندوں کے حوالے کر دیتے اور بیدردی سے مارے جانے والوں کا تماشہ دیکھتے۔ جب شہر کے حالات خراب ہوئے تو مسلمانان جموں کو اعلانات کر کے بتایا گیا کہ نومبر کو قافلے 6

روانہ ہوں گے جنہیں فوج کی حفاظت میں پاکستان پہنچایا جائے گا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ جموں شہر جمع ہوئے۔ انہیں ٹرکوں میں جانوروں کی طرح اڑھس لیا گیا۔ پناہ کی تلاش میں نکلے یہ قافلے شہر سے نکل کر ویران مقامات پر پہنچتے تو ان کی تاک میں بیٹھے مسلح ہندو ان پہ ٹوٹ پڑتے۔ مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ کی جاتی۔ مردوں اور بچوں کو قتل کرتے اور عورتوں کی آبرو ریزی کی جاتی اور ان کو اغوا کر لیتے۔ اس سانحے میں مسلم کانفرس کے سربراہ چوہدری غلام عباس مرحوم کی صاحبزادی کو بھی اغواء کیا گیا جس کا بعد میں بھی کوئی سراغ نہ مل سکا۔ غرض نہ کسی امیر کو بخشا گیا اور نہ غریب کو۔ بلا تفریق خون مسلم سے ہاتھ رنگے گئے۔ بھارت، ڈوگرہ حکومت اور انتہا پسند تنظیموں نے مل کر جو رقص ابلیس برپا کیا اس کے نتیجے میں لاکھوں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ان کی تعداد میں فرق ہے۔ عام خیال ہے کہ 6 لاکھ افراد قتل ہوئے کچھ نے 5 لاکھ گنوائے اور کچھ ہندی جرائد نے یہ تعداد 2 لاکھ بتائی۔ تعداد میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ منظم منصوبہ بندی کی وجہ سے ہوا۔ کرنے والوں نے اس کی تعداد بتائی نہیں اور ظلم کا شکار ہونے والے دنیا کو روداد سنانے کے لیے بچے نہیں۔ کچھ لوگ جو خوش قسمتی سے بچ پائے انہوں نے ان واقعات کو بیان کیا۔

واقعے میں ہلاکتوں کی تعداد خواہ کچھ بھی ہو یہ واقعہ انسانی تاریخ پہ

بدنما دھبا ہے۔ بھارت سرکار کے سیکولرازم کے پردے کے پیچھے چھپے بھیانک چہرے کو بے نقاب کرنے کے لیے یہی ایک واقعہ کافی ہے۔اس عظیم سانحے پہ ہندو لیڈر گاندھی جی بھی خاموش نہ رہ سکے اور اس کی ذمہ داری ڈوگرا حکومت پہ عائد کر دی اسی جرم کی پاداش میں انہیں بھی ہندو جنونیت کا نشانہ بننا پڑا۔ لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہماری حکومتوں نے اس واقعے کو کسی بین الاقوامی فورم پہ اجاگر نہیں کیا۔اقوام عالم کو یہ باور نہیں کرایا گیا کہ سیکولر بھارت کی بنیاد ہی انتہا پسندی اور دہشتگردی پہ رکھی گئی ہے۔ جبکہ ہندوستان کی حکومت اور میڈیا پاکستان میں ہونے والی دہشتگردی کی کسی بھی کاروائی کو عالمی منظر عام پہ لانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اقوام عالم میں پاکستان کو دہشتگرد اور انتہا پسند قرار دلوانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ 1947 سے لے کر اب تک کی بھارتی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر عیاں ہوتی ہے کہ ہندوستان میں ہندو جنونیت کسی دوسرے مذہب یا قوم کو برداشت کرنے کی روادار نہیں اور مسلم دشمنی تو ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ ہندو انتہا پسندوں کی کوشش ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو یا تو ہندو تہذیب میں ضم کر دیا جائے یا انہیں ہندوستان سے نکال دیا جائے اور جہاں یہ دونوں عمل نہ ہو سکیں تو وہاں قتل عام اور نسل کشی کے ذریعے اپنے اہداف حاصل کیے جائیں ۔ بھارت میں تمام اقلیتوں کے خلاف مذہبی جنونیت کے متعدد مظاہرے ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ہمارے ہاں ہونے والی

دہشتگردی میں بھی اکثر بھارتی خفیہ ایجنسیوں کا ہی ہاتھ ہوتا ہے البتہ کرائے کے قصاب انہیں ہماری ہی صفوں سے مل جاتے ہیں۔ قتل عام اور نسل کشی کی کئی داستانیں ہیں حالیہ دور میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت میں کیے جانے والے مسلم کش اقدامات اس کی بین مثالیں ہیں۔ اگر یہی سب کچھ کسی یورپی قوم کے ساتھ ہوا ہوتا تو آج تک اقوام متحدہ سمیت تمام عالمی برادری اس کا نوٹس لے چکی ہوتی لیکن مقام افسوس ہے کہ ہماری سیاسی قیادت، سفارتی ٹیم اور قلمکار اسے اقوام عالم تک پہنچانے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ عالمی ضمیر کو ایک بار پھر پوری قوت کے ساتھ جھنجوڑنے کی ضرورت ہے۔ آج کے قلم کار اور تجزیہ نگار حضرات ماضی کو فراموش کرکے بھارت کے ساتھ دوستی کا درس دیتے ہیں۔ ہندو اور مسلم کو ایک ہی تہذیب قرار دیتے ہیں۔ دو قومی نظریے کے پیچھے بھی لبرل بنیادیں تلاش کرتے ہیں۔ کشمیر کو بھول کر دوطرفہ تجارت کی بات کی جاتی ہے۔ ان قلمکاروں نے کشمیر کو سرحدی تنازعہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ بھارت اس سوچ کو پروان چڑھا رہا ہے اور ان لوگوں کی بھرپور معاونت کر رہا ہے جو سوشل و الیکٹرانک میڈیا پہ آکر دو قومی نظریے اور نظریۂ پاکستان سے متضاد رائے دیتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ محض سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ یہ کروڑوں مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ ہے کشمیر کی مسلم اکثریت کی بقا کا مسئلہ ہے۔ آج بھارتی آشیرباد پہ کچھ نام

نہاد قوم پرست ڈوگرا راج کے راگ الاپ رہے ہیں اسے کشمیر کا سنہری دور قرار دے رہے ہیں۔ یہ عاقبت نا اندیش لوگ گلاب سنگھ کو ہیرو کے طور پہ پیش کر رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں ان لوگوں نے کینیڈا میں گلاب سنگھ کی برسی بھی منائی ہے جسے چند پاکستانی میڈیا گروپس نے بھی نشر کیا۔ حیرت تو اس بات پہ ہے کہ ان گلاب سنگھی حضرات کو اپنے میں سے کوئی لیڈر بھی نہیں مل سکا جو ایک ملعون ترین شخص کی پرستش شروع کر دی؟ جموں میں قتل ہونے والے لاکھوں افراد ان گلاب سنگھی افراد سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کریں؟ کشمیری قوم پرستی کا دعوی کرنے والو! ہمارے ہی قاتلوں کی برسیاں کس منہ سے مناتے ہو؟ جدیدیت کا شکار ہوے والے اہل قلم دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ سنہرے سپنے ضرور دیکھیں، دوستی کی بات ضرور کریں مگر تاریخی حقائق سے پردہ پوشی نہ کریں۔

دے رہے ہیں جو لوگ تمہیں رفاقت کا فریب
ان کی تاریخ پڑھو گے تو دہل جاؤ گے

اللہ تعالی شہدائے جموں کی قربانی کو قبول فرمائے اور ان کی جانوں کے صدقے ہمیں دوست اور دشمن میں فرق کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام امت مسلمہ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

کوزہ دست عدو خون مسلماں سے ہے لبریز

گزشتہ دنوں بنگلہ دیش کی لبرل و سیکولر حکومت نے پاکستان سے وفاداری نبھانے کی پاداش میں دو افراد کو دہشتگرد قرار دے کر تختۂ دار پہ لٹکا دیا۔ ان افراد کا جرم صرف یہ تھا کہ 1971 کی پاک بھارت جنگ میں انہوں نے اپنے وطن پاکستان کی فوج کا ساتھ دیا تھا اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کی آخری حد تک کوشش کی۔ وطن سے محبت ہی ان کا گناہ ٹھیہرا۔ چونکہ یہ اقدام ایک لبرل و سیکولر حکومت نے اٹھایا ہے اس لیے اسے انتہا پسندی یا شدت پسندی سے موسوم نہیں کیا گیا اور چپ سادھ لی گئی۔ فی زمانہ یہ طے پایا ہے کہ شدت پسندی یا انتہا پسندی اس فعل کو کہا جائے گا جو مذہب خصوصا اسلام کے نام پہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں سوشل میڈیا سے منسلک کروڑوں صارفین نے بھی پاکستان سے ہمدردی کے لیے کوئی علامتی احتجاج تک نہیں کیا۔ کوئی تصویر پاکستانی پرچم سے رنگین نہیں ہوئی۔ ایک ہو کا عالم ہے اور ہماری تنہائی۔ پاکستان کی سیکولر لابی اسے بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ قرار دے رہی ہے جبکہ پاکستان کی حکومت اپنے تعلقات کے خدشے سے انگشت بدنداں ہے۔ دوسری جانب فرانس کے دارالحکومت پیرس میں ہونے والا دہشتگردی کا واقعہ عالمی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کبھی اس حملے کو تمام یورپ پہ حملہ قرار دیا جاتا ہے تو کبھی پاپائے روم اسے انسانیت کے خلاف جرم

عظیم قرار دیتے ہیں ۔ دیرینہ حریف روس اور امریکہ کے صدور سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور داعش کے خلاف عسکری کاروائی کا عندیہ دیتے ہوئے ایک مشترکہ اعلامیہ بھی جاری کرڈالتے ہیں۔ تمام مغربی اہل قلم مسلم حکمرانوں پہ زور دے رہے ہیں کہ وہ اپنے ممالک میں انتہا پسندی کے رجحانات کا جائزہ لیں اور ان کے سرچشموں کا قلع قمع کریں ۔ ادھر مسلم ہیں کہ فرانس کے جھنڈے سے اپنی تصاویر رنگ کر اظہار یکجہتی کر رہے ہیں ۔

پیرس واقعہ یقینا انسانیت پہ شب خون ہے اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے ۔ بے گناہ افراد کی جان لینا عظیم گناہ ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہے ۔ تعلیمات اسلامیہ کے مطابق کسی ایک انسان کا قتل تمام انسانیت کے قتل کے مترادف ہے ۔ لیکن یہ امر تشویشناک ہے کہ دہشت گردی ، انتہا پسندی اور شدت پسندی کا تعلق اسلام اور ملت اسلامیہ سے جوڑا جا رہا ہے ۔ حالانکہ اس حملے کے دوران بھی فرانس کے مسلم شہریوں نے اپنی جان پہ کھیل کر لوگوں کی جان بچائی۔ مغرب نے ان مسلمان شہریوں کی انسانی ہمدردی کی کاروائیوں کو پردۂ اخفا میں رکھا اور دہشت گردی کے تانے بانے مسلم دنیا سے ملانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ عالم اسلام کو شدت پسندی اور انتہا پسندی کا مورد الزام ٹھیہرانا مغرب کے دوہرے معیار کی عکاسی کرتا ہے ۔ اگر قلب سلیم اور چشم بینا کے ساتھ ان واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ۔

مغرب خود کو جمہوری اقدار کا علمبردار کہلاتا ہے جس کی اساس شخصی آزادی اور انسانی حقوق ہیں لیکن فرانس کی پارلیمنٹ نے ماضی قریب میں مسلم دشمنی پہ مبنی جو قانون سازی کی ہے وہ شخصی آزادی اور اقلیتوں کے انسانی حقوق کے تمام تر دعوؤں کی قلعی کھول دیتے ہیں۔اکیسویں صدی میں فرانس کی جانب سے اسلامی اقدار اور مسلم شہریوں کے ساتھ تعصب پہ مبنی سلوک کو محض اسلیے برداشت کیا جا رہا ہے کہ یہ فرانس کی سیکولر حکومت کی جانب سے ہے۔اس اقدام کو انتہا پسندی یا شدت پسندی بھی اسی لیے نہیں قرار دیا جاتا کہ یہ اقدام مغرب کے ایک سیکولر ملک نے اٹھایا ہے۔ڈنمارک میں آزادیٔ رائے کی آڑ میں گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کا معاملہ کسی انتہا پسندی کا شاخسانہ قرار نہیں دیا جاتا کیونکہ دل آزاری مسلم دنیا کی ہوئی ہے اور کرنے والا سیکولر ملک ہے ۔امریکہ کے چرچ میں قران پاک کی بے حرمتی کو انتہا پسندی اور شدت پسندی سے منسوب اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ پادری مسلمان نہیں تھا۔جرمن حکمران مسلم دشمنی پہ مبنی بیانات دیتے ہیں تو اسے بھی انتہا پسندی و شدت پسندی سے تعبیر نہیں کیا جاتا کیونکہ اسکے مرتکب مسلم نہیں بلکہ مغرب کے سیکولر ہیں۔

جو پائمال کروگے ادب کے خوابوں کو
تو واقعات کی صورت میں خواب ابھریں گے

مغرب جمہوریت کا علمبردار تو ہے لیکن عالم اسلام میں جمہوریت مغرب کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ترکی میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی جیت مغرب کو کسی صورت ہضم نہیں ہو رہی ۔ ماضی میں بھی اسلام پسند جماعتوں کو فوجی طاقت سے کچلا گیا یہاں تک کہ منتخب وزیر اعظم تک کو تختۂ دار پہ لٹکایا گیا۔ لیکن مغرب کی حکومتوں نے اسے انتہا پسندی یا شدت پسندی نہیں گردانا کیونکہ جمہوریت کو پٹری سے اتارنے والے سیکولر تھے ۔الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کی منتخب حکومت کو فرانس کی براہ راست مداخلت سے فوجی طاقت کے ذریعے کچلا گیا۔ مغرب نے اس پہ سکھ کا سانس لیا۔ فلسطین کی حماس نے الیکشن جیت کر حکومت سازی کی جو مغربی ممالک کو ہضم نہیں ہوئی۔ مصر میں اخوان المسلمون کی قائم کردہ منتخب جمہوری حکومت کو فوج کے ذریعے ختم کیا گیا۔ اخوان کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور ہزارہا کارکنان کو اذیت دی گئی لیکن اہل 6000 مغرب نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ قتل عام کرنے والی فوج سیکولر تھی اور متاثرہ حکومت اسلام پسند۔ برما میں خون مسلمان سے ہولی کھیلی گئی مگر مغرب نے اسے انتہا پسندی قرار نہیں دیا بھارت کی سیکولر جمہوریہ میں مسلمانوں کو اس بنا پہ قتل کیا جاتا ہے کہ وہ مسلم ہیں۔بی جے پی کی حکومت نے علی الاعلان مسلم دشمنی کی روش اپنا رکھی ہے لیکن اسے انتہا پسندی یا شدت پسندی سے موسوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ۔ کشمیر میں بھارتی فوج نے گزشتہ

تین دہائیوں میں ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کی جان لی لیکن بھارت کو دہشتگرد، انتہا پسند یا شدت پسند ریاست محض اسلیے نہیں قرار دیا جا رہا کہ وہ سیکولر ہے۔

تمہارے فیض سے تھی جن کی خانہ ویرانی
یہی ہے وقت کہ وہ خانہ خراب ابھریں گے

اگر انتہا پسندی کے سوتوں کو تلاش کرنا ہے تو مسلم حکمرانوں کو پکارنے کے بجائے سپین کی مسجد قرطبہ کے دروازوں پہ پڑے قفل سے پوچھئے شاید وہ انتہا پسندی اور شدت پسندی کی جڑوں کا کوئی پتہ بتا سکے۔ سپین میں مسلمانوں کے ان قبرستانوں سے پوچھئے جنہیں ہموار کر کے سٹیڈیم بنا دیا گیا ہے اور اب ان پہ سانڈھ دوڑائے جاتے ہیں۔ جرمنی کی اس عدالت کے در و دیوار سے پوچھیے جہاں ایک خاتون کو محض اس بنا پہ قتل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق حجاب پہنتی تھی۔ ڈنمارک کی پرنٹنگ پریس کی مشینیں اور ان پہ لگی سیاہی بھی انتہا پسندی کے نشانوں کا پتہ دے گی۔

مغرب کی پالیسیوں کا تجزیہ کریں تو اہل غرب کا انتہائی کریہہ چہرہ سامنے آتا ہے۔ علم و ہنر میں آگے ہونے اور ٹیکنالوجی کی چکاچوند نے مغرب کا اصل چہرہ دھندلا دیا ہے۔ اقوام مغرب اب بھی خون مسلم کی پیاسی ہیں۔ تہذیب کے نقاب

اوڑھ کر مغرب نے خود کو خوشنما بنا رکھا ہے حالانکہ مغرب کی اجتماعی سوچ آج بھی درندگی پہ مبنی ہے۔ پیرس حملے جیسے بیسیوں واقعات کو بنیاد بنا کر وہ اہل اسلام کے خون سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ 11/9 کے واقعات کو بنیاد بنا کر افغانستان پہ حملہ کیا گیا لیکن لاکھوں افراد کی جانیں لی گئیں، اور جانوں کے ضیاع کا سلسلہ تا حال جاری ہے ۔بڑے پیمانے پہ تباہی پھیلانے والے کیمیاوی ہتھیاروں کی موجودگی کو جواز بنا کر عراق پہ حملہ کیا گیا اور اب تک 2 لاکھ سے زائد افراد لقمہ اجل بنائے جا چکے۔ لیکن اب بھی مغرب کی پیاس بجھی نہیں ہے۔ اہل مغرب شام میں رقص ابلیس برپا کر کے مسلمانوں کے بہتے لہو کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اہل مغرب کا وطیرہ ہے کہ وہ تہذیب کے خوشنما لبادے میں چھپ کر وار کرتے ہیں۔ جال تیار کرتے ہیں مہرے تلاش کرتے ہیں اور پھر شکار پہ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم مہرہ بھی بن جاتے ہیں اور شکار بھی۔

بیسویں صدی کے آغاز پہ ہی امت مسلمہ کی شیرازہ بندی کر دی گئی۔ علاقائی اور لسانی بنیادوں پہ تقسیم امت مسلمہ سے روح ایمانی ہی نکال دی گئی ہے۔ اب ایک ملک کے مسلمانوں کی بربادی پر دوسرے ملک کے مسلمان غمزدہ نہیں ہوتے بلکہ سب سے پہلے فلاں کا نعرہ لگا کر دوسرے کو دشمن کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جیسے ہم نے افغانستان کے ساتھ کیا اور بعد

میں ہمیں ساٹھ ہزار سے زائد جانوں کا نذرانہ دینا پڑا اور اب بھی کئی علاقون میں فوجی آپریشن جاری ہے۔ جبکہ مغرب دوستی کا جھانسہ دے کر امت مسلمہ کی بیخ کنی کر رہا ہے۔ وہ ایک طرف دہشت گرد تنظیموں کو مالی امداد فراہم کرتا ہے عوام کو حکومتوں کے خلاف اکساتا ہے اور پھر خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں جانب نقصان امت مسلمہ کا ہی ہوتا ہے۔ کبھی یہی مغرب ہمارے فقہی اختلافات کو ہوا دے کر مسلکی نزاع پیدا کراتا ہے جو بعدازاں علاقائی جنگوں کا باعث بنتا ہے۔ عراق ایران جنگ اس کی بین مثال ہے اس جنگ میں لاکھوں افراد لقمۂ اجل بنے۔ دونوں ملکوں نے اپنے عسکری اور مالی وسائل کو بے دریغ ضائع کیا اور جب مغربی ممالک نے عراق پہ چڑھائی کی تو اسکے پاس مقابلے کی سکت ہی نہیں تھی۔ آج شام کے مخدوش حالات ایک اور جنگ کا پیغام دے رہے ہیں امت مسلمہ کے حکمران ان مغربی طاقتوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں غرض ہماری رگ و پے مغرب کے ہاتھ میں ہے اور کوزۂ دستِ مغرب خونِ مسلماں سے ہے لبریز۔ اس تمام صورتحال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل اسلام بیدار ہوں اپنے خلاف ہونے والی سازشوں سے آگاہ ہوں اور دیوار بن کر ان قوتوں کا مقابلہ
کریں۔ امت مسلمہ کے ارباب اختیار کی ذمہ داری ہے کہ وہ حالات کا بغور جائزہ لیں اور ایسی حکمت عملی مرتب کریں کہ امت کا اتحاد دوبارہ قائم ہو جائے۔ امت مسلمہ کے اتحاد میں ہی ہماری بقا ہے ورنہ مغربی چنگیزیت ہمیں دنیا سے فنا کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دشمن کے شر سے

محفوظ فرمائے ۔ آمین

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا

مکہ مکرمہ کے نواح میں عرفات کے میدان میں لاکھوں فرزندان توحید کا جم غفیر جمع ہے حقیقی عاشقان رسول ﷺ کی آنکھیں دیدار مصطفیٰ ﷺ کی منتظر تھیں اور ان کی سماعتیں دنیا کے سب سے شیریں بیاں اور کلمات سننے کے منتظر تھے۔ لگتا تھا موتی تقسیم ہوں گے اور ہر کوئی حسب استطاعت انہیں چننے کے لیے منتظر کھڑا ہے۔ ان کی اکثریت عرب تھی اور عرفات کی فضائیں ان کے لیے نئی نہ تھیں لیکن وہ جس کو سننے اور دیکھنے آئے تھے وہ دنیا میں اپنے رب کا خاص تھا۔ وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے جس کے لیے رب نے یہ سب کائنات تخلیق کی تھی۔ پھر سب کا انتظار ختم ہوا۔ محبوب خدا ﷺ منبر پہ جلوہ افروز ہوئے اور فضاء میں چاشنی بکھیرتی صدا بلند ہوئی اللہ کا ذکر اور وہ بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کی زبان سے بلند ہوا۔ پھر صدا بلند ہوئی اے لوگو میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔۔ تمام سماعتیں منبر رسول ﷺ کی جانب متوجہ ہو گئیں لیکن پھر ان چاشنی بھرے لفظوں نے سب کی آنکھوں کو نم کر دیا۔۔۔۔۔۔۔ حبیب خدا ﷺ فرما رہے تھے کہ: ''میرا خیال ہے کہ شاید اس سال کے بعد میں تم سے اس جگہ نہ مل سکوں اور نہ شاید اس سال کے بعد حج کر سکوں۔۔۔۔۔'' یہ وہ الفاظ تھے جو عاشقان رسول ﷺ پہ گراں گزرے۔۔۔۔ ہر شخص حبیب خدا کی جدائی کا سن کر دل گرفتہ تھا۔۔۔ اس غم واندوہ کے باوجود وہ سب اس خطبے کو غور سے سننے میں

منہمک تھے کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر یہ آخری کلمات ہیں تو پھر یہ اہم بھی ہیں کیونکہ یہ الفاظ اس دین حق کا خلاصہ ہیں جسے قائم کرنے کے لیے وہ دنیا میں مبعوث ہوئے، اپنوں اور غیروں کی جانب سے تکالیف برداشت کیں، اپنا وطن و گھر بار چھوڑا، جنگ میں زخم کھائے اور بالآخر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے گرد و پیش میں نافذ کیا۔ یہی خطبۂ حجۃ الوداع تھا جو انسانیت کے نام رب کا آخری پیغام تھا اور اسی میں انسانیت کا راز مضمر ہے۔

خطبۂ حجۃ الوداع کو چودہ صدیاں بیت گئیں لیکن صاحب ضمیر اور صاحب احساس انسانوں کے لیے یہ آج بھی اس کے الفاظ تروتازہ ہیں۔ وہ آج بھی دلوں پہ اپنا اثر کرتے ہیں، وہ آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں، وہ آج بھی دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے ضمانت ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانیت کو اخروی فلاح سے ہمکنار کرانے کا واحد ذریعہ بھی ہیں۔ آج جہاں ہم عشق رسول ﷺ کے دعویدار بن کر مجالس برپا کرتے ہیں میلاد مناتے ہیں جلوس نکالتے ہیں قصیدے پڑھتے ہیں اور دل کو تسکین دیتے وہیں اگر ہم اپنے نبی ﷺ کی زندگی کے سنہرے باب یعنی خطبۂ حجۃ الوداع کو عالم انسانی تک پہنچائیں تو شاید اس دور کی تقدیر بھی بدل جائے۔

نبی ﷺ نے حمد و ثناء کے فوراً بعد ہی تقسیم رنگ، زبان و نسل کے تمام

امتیازات کو مٹادیا اورفرمایا: لوگو! اللہ نے فرمایا ہے کہ میں نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیااور تم کو قوموں اور قبائل میں تقسیم کیا تاکہ تم پہچانے جا سکو اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پہ اور کسی عجمی کو کسی عربی پہ کوئی فضیلت حاصل نہیں نہ کسی گورے کو کسی کالے اور نہ ہی کسی کالے کو کسی گورے پہ کوئی برتری حاصل ہے۔۔برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پہ ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے تھے۔اگر ان الفاظ کو ہی پوری دنیاکے ساتھ ترازو پہ تولیں تو یہ الفاظ بھاری ہوں گے۔ دنیا میں قیام امن کی جتنی بھی کوششیں ہو رہی ہیں وہ سب اس وقت تک بار آور ثابت نہیں ہو سکتیں جب تک انسانیت گھٹنے ٹیک کر نبی ﷺ کے اس فرمان کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے۔ اس خطبے میں رنگ و نسل علاقائیت و لسانیت کے تمام تر تعصّبات کی نفی کرکے تمام انسانوں کو برابر قرار دیا گیا ہے۔ معاشرتی عدل و مساوات کی یہ اساس دنیاکے کسی مذہب، قانون یا اخلاق میں موجود نہیں۔ اگر دنیاکے تمام انسان اس قول پہ عمل درآمد کریں تو دنیا سے عالمگیریت، نوآبادیات اور دیگر استحصالی نظام ختم ہو جائیں اور محکوم بھی سکھ کا سانس لیں۔ لیکن جو خود کو عاشق رسول کہلاتے ہی نہیں تھکتے وہ خود تفریقِ رنگ و نسل کا شکار ہو کر ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں اور علاقائی، لسانی اور نسلی تعصب کی بنا پر ایک دوسرے سے نفرت کر رہے ہیں۔ کوئی سندھی ہے تو کوئی بلوچی کوئی پٹھان ہے کوئی پنجابی، کوئی

ایرانی کوئی عربی کوئی ترک اور کوئی افریقی ۔ اب تو سوال یہ ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع کے یہ الفاظ خود مسلمانوں کے دلوں میں کیوں نہیں اتر رہے ؟ بقول شاعر

یوں تو مرزا بھی ہو سید بھی ہو افغان بھی ہو
تم تو سب ہی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اسکے بعد نبی ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو تمہارے لیے تمہارے خون [جانیں] تمہارے مال، تمہاری عزت و آبرو قیامت تک کے لیے تمہارے لیے حرام ہیں جیسے، اس دن اس مہینہ اور اس شہر کی تمہارے لیے حرمت ہے ۔لوگو ! ''خوب جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں ۔ تمہارے غلام تمہارے غلام ہیں جو خود کھاؤ وہی انہیں بھی کھلاؤ جو خود پہنو انہیں بھی پہناؤ۔'' اسی طرح فرمایا''خبردار میرے بعد گمراہ یا کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔اگر کوئی نکٹا اور سیاہ فام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ شریعت کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی تابعداری کرنا۔''انسانی جان کی حرمت کی تعلیم ہر نبی نے اپنی قوم کو دی ہے اور اسلام تو آخری اور جامع دین ہے ۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم تھی کہ ''کوئی اگر تجھے ایک گال پہ تھپڑ مارے تو دوسری گال اس کے آگے کر دے'' لیکن عیسائیت نے اس تعلیم سے پہلو تہی کی اور قتل و غارتگری سے دنیا میں فساد

برپا کیا لیکن اہل اسلام نے اس تعلیم کو بھی عملی جامہ پہنایا۔ خطبہ حجۃ الوداع کی تعلیمات مسلمانوں سے بالخصوص مخاطب ہیں ان تعلیمات میں کھلے لفظوں میں ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ اگر دور حاضر میں جا بجا پھیلی فرقہ واریت کی آگ کو دیکھا جائے تو ہمارا مسلماں ہونا ایک سوالیہ نشان بن جائے۔ ہم ہیں کہ اسی فرقہ واریت کا شکار ہیں اور ڈھٹائی سے خود کو عاشق رسول ﷺ بھی کہتے ہیں۔ فرقہ واریت اور مسلکی نزاع کو نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے اور باہم دست و گریبان ہونے کو کفر اور جاہلیت قرار دیا ہے لیکن عملی طور پہ ہم ایک دوسرے سے باہم گتھم گتھا ہیں اور ہمارے ہاتھ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے حقوق اللہ (نماز، روزہ، زکوۃ، حج) کو لازمی قرار دیا عورتوں کے مردوں پہ اور مردوں کے عورتوں کے حقوق کو بیان فرمایا اور امانتوں کو، ان کے اہل افراد تک پہنچانے کی تاکید کی۔ جاہلیت کے دور کی رسومات کو فسخ کیا، سود کو بالکل منع فرمادیا، ایک دوسرے کے مال میں بلا اجازت تصرف سے منع کیا اور ہر قسم کی زیادتی سے بھی منع فرمایا۔ اسکے علاوہ اللہ کی طرف سے قائم کردہ قانون میراث پہ عمل درآمد کرنے کی سختی سے تاکید فرمائی۔ ان سب امور پہ اجمالی نظر دوڑائیں تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ من حیث المسلم ہم نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ عبادات

معاملات اور حسن معاشرت میں ہم نے بے عملی کا مظاہرہ کر رکھا ہے۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں لیکن دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم عاشق رسول ﷺ ہیں بقول شاعر

تیرے حسن خلق کی اک رمق میری زندگی میں نہ مل سکی
میں اسی میں خوش ہوں کہ شہر کے در و بام کو تو سجا دیا

نبی ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرما دیا تھا کہ " میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ "میں تمھارے درمیان ایک ایسی نعمت چھوڑ کے جا رہا ہوں کہ اگر اسے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ نعمت ہے اللہ کی کتاب اور میری سنت"۔ اب یہ امر مسلّم ہے کہ اب کوئی اللہ کا پیغام لے کر نہیں آئے گا کوئی دل کے دروازے پہ دستک نہیں دے گا کوئی صدا نہیں لگائے گا۔ یہی آخری پیغام ہے اور ہمیں اس پہ عمل کرنا ہے۔ اللہ کے آخری نبی ﷺ نے اپنا آخری عالمی پیغام دنیا تک پہنچا دیا۔ اس پیغام اقوام عالم کا مشترکہ اعلامیہ قرار دے کر اس پہ عمل پیرا ہوا جائے تو دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ لیکن جو اس کے پہلے مخاطب تھے یعنی مسلمان وہ خود ہی اس پیغامِ زندگی سے غافل ہو گئے ہیں۔ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ حب رسول ﷺ کے اظہار کے طور پہ منایا جاتا ہے۔ سیرت النبی ﷺ کے تمام گوشوں کو دنیا کے سامنے لانا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا احکام خداوندی کی پیروی کر کے امن و سکون کا

گہوارہ بنے تو ہمیں نبی ﷺ کے آخری خطاب کے آخری جملے پہ عمل پیرا ہونا ہوگا آپ ﷺ نے فرمایا ''خبر دار ! تم میں سے جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں'' اب یہ ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے آخری پیغام پہ خود بھی عمل کریں اور اس پیغامِ زندگی سے دنیا کو بھی روشناس کرائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حب رسول ﷺ کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اس پیغام کو دنیا تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبت زاغ

سڑک پہ اکثر اوقات بچے کھیلتے ہیں اور کبھی کبھار یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ کوئی شرارتی بچہ سڑک کے عین بیچ میں کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ سڑک کے ایک جانب سے تیز رفتار گاڑی اس کی جانب بڑھ رہی ہوتی ہے۔ بچہ کچھ عجیب و غریب زبان مین کچھ بول بولتا ہے اور اپنی ننھی ہتھیلی گاڑی کی جانب کر لیتا ہے جیسے وہ اس ننھی ہتھیلی سے اس گاڑی کو روک دے گا۔ اس ڈر دے کہ کہیں وہ گاڑی کا نشانہ نہ بن جائے کوئی راہگیر اسے لپک کر سڑک کے کنارے رکھ دیتا ہے۔ بچہ غصے سے اس بچانے والے کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر اسے اس طرح کرنے سے منع کیا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں تو کارٹون کی طرح جادوئی الفاظ بول کر اس گاڑی کو روک لیتا۔ اگر دورِ جدید کے بچوں کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ المیہ ہر بچے کے ساتھ ہے۔ وہ کارٹون کی مانند جادوئی طریقے سے ہوا میں معلق رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی چیز چاہیے تو کسی سے طلب کرنے کے بجائے چھو منتر کے ذریعے حاضر کرنے کی کوشش کرے گا۔ سکول جانے کا موڈ نہ ہو تو بیمار ہونے کا بہانہ نہیں کریں گے بلکہ اپنی وردی (یونیفارم) کو گندا کر دینگے یا اپنا جوتا کہیں چھپا دیں گے۔ کامیابی کی صورت میں اس پہ ارائیں گے۔ غرض ہر بچہ کسی مخفی و پوشیدہ طاقت کے ذریعے اپنی خواہشات کے حصول کا متمنی ہے۔ وہ محنت کے بجائے آسان راستے اور

: چالبازی سے منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ بقول اقبالؒ

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبت زاغ

دورِ جدید میں جہاں سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی میں سہولیات کی فراوانی کی ہے وہیں علم اور معلومات تک رسائی بھی آسان کر دی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، انٹرنٹ اور موبائل جیسی سہولیات نے انسان کی رسائی کو آسان کر دیا ہے۔ ان تمام ایجادات کے ذریعے بچوں کو اپنی دلچسپی کے لیے جو سامان ملا ہے وہ ہے کارٹون۔ جدید دور کے بچوں کو تفریح اور کھیل تماشے کے لیے جو سب سے عزیز تر چیز ملی ہے وہ ہے کارٹون۔کارٹون مکسر عکس ہے یعنی کسی بھی چیز کا ٹوٹا پھوٹا عکس جو دیکھنے والے کو ہنسی پہ آمادہ کر دے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حیوانات اور جمادات کو انسانی روپ میں پیش کرنے کو کارٹون کہتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پہ تصاویر ہوتی ہیں جو ایک مخصوص رفتار سے حرکت دینے پہ چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہیں۔اسکے بعد انسانی آواز اس میں شامل کی جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کارٹون کوئی زندہ مخلوق ہے جو ہماری طرح چلتی پھرتی، کھاتی پیتی اور بولتی ہے۔ لیکن کارٹوں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ کچھ غیر مرئی اور طلسماتی خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک کارٹون سویں منزل سے گرتا ہے اور صرف اسکے سر کے گرد کچھ ستارے گردش کرتے

ہیں ۔ دوڑتے بھاگتے وہ ہوا میں معلق بھی ہو جاتا ہے اور جاب اسے پتہ چلتا ہے تب وہ نیچے گرتا ہے ۔ یہ ما فوق العادت خصوصیات دیکھ کر بچے اسکو عملی نمونہ سمجھ بیٹھے ہیں اور اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

کارٹون محض متحرک تصاویر ہوتی ہیں ان میں یہ طلسماتی قوت کہاں سے در آتی ہے ؟ اصل میں یہ طلسماتی قوتیں اس ذہن کی پیداوار ہیں جو ان کارٹون کے پیچھے کارفرما ہے ۔ یہ کارٹون کو متحرک کرنے والے کا تخیل ہے جو پردۂ دور نما (ٹیلی ویژن کی سکرین) پہ حقیقت کا روپ دھارتے نظر آتا ہے اور دیکھنے والے کی آنکھ کو خیرہ کر دیتا ہے اور اسکے ذہن کو گرویدہ کرلیتا ہے۔ اور بچے معصوم ہونے کی وجہ سے اس کے سب سے زیادہ گرویدہ ہیں ۔ کارٹون کو موجودہ شکل میں منظر عام پہ لانے والا والٹ ڈزنی ہے جو امریکی شہری تھا۔ والٹ ڈزنی ایک مقبول فلمساز، کامیاب تاجر ، مقبول عام کارٹون کا موجد، ڈزنی لینڈ تھیم پارک کا موجد اور دنیا پہ سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے شخص کی حیثیت سے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے ۔ والٹ ڈزنی نے امریکی اور غیر امریکی اذھان کو اپنی فکر سے بے حد متاثر کیا ہے ۔ پہلی جنگ عظیم میں وہ کم عمری کی وجہ سے شرکت نہ کر سکا مگر وہ ایک خدمتگار کی حیثیت سے جنگ کا حصہ رہا۔ والٹ ڈزنی نے اپنی فلموں کے ذریعے امریکی افواج کے لیے رائے عامہ ہموار کی اور فوج کے مورال کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ والٹ ڈزنی اور اسکی کمپنی نے کارٹون

فلموں کی صنعت کے ذریعے لوگوں کے اذہاں پہ گہرے اثرات مرتب کیے۔ والٹ ڈزنی نے اپنے کارٹون کے حوالے سے تھیم پارک بھی قائم کیا۔ اس کا مقصد کارٹون کو تصورات سے نکال کر ٹھوس شکل میں لایا جائے۔ اس پارک میں والٹ ڈزنی کے بنائے کارٹون ٹھوس شکل میں موجود ہیں اسکے علاوہ اس پارک کے جھولوں میں بل کھاتی ریلیں اور الٹی لٹکتی گاڑیاں ہیں جن پہ سوار ہو کر طلسماتی دنیا کی طرح الٹا لٹک کر سفر کیا جا سکتا ہے ہوا میں معلق ہونے کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے وغیرہ۔

موجودہ دور کے کارٹون کا موازنہ اگر خلافت عباسیہ کے آخری ایام میں باطنی فرقے کی جانب سے قائم کی گئی فردوسِ بریں سے کریں تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ یہ ایک جنت تھی جو فرقہ باطنیہ نے قائم کی تھی، یہ پہاڑی سلسلے کے بیچ میں ایک وسیع و عریض باغ تھا جس میں جنت کی خوبیوں کی طرح دودھ کی نہریں تھیں خوبصورت عورتیں تھیں، روشنیاں تھیں۔ یہاں افراد کو ہپناٹائز کرکے اور حشیش پلا کر لایا جاتا اور اس جنت کی سیر کرائی جاتی۔ اسکے بعد ان افراد سے اپنی مرضی کے کام کرائے جاتے جن میں علمائے حق کا قتل بھی شامل ہے۔ والٹ ڈزنی نے بھی کارٹون فلمیں بنائیں اور پھر تھیم پارک تخلیق کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھنے والوں کو یہ باور کرایا جائے کہ کارٹون محض تصویروں کی حرکت کا نام نہیں بلکہ اسکی ٹھوس عملی شکل موجود ہے۔ جدید سائنس جادوئی قوتوں کی

موجودگی کا انکار کرتی ہے جن کے ذریعے انسان طاقت اور غلبہ حاصل کر سکتا ہے لیکن والٹ ڈزنی اسی سائنس کے ایجاد کردہ کارٹون کے ذریعے ایسی پوشیدہ قوتوں کی موجودگی اور برحق ہونے کے لیے ذہن سازی کر رہے ہیں۔

مغرب میں خصوصا امریکہ میں کسی بھی کامیاب شخص یا ادارے کو لازمی طور پہ کسی خفیہ تنظیم کا رکن سمجھا جاتا ہے۔ والٹ ڈزنی کے بارے میں بھی یہی خیال ظاہر کیا جاتا ہے۔ عموما اس طرح کے کامیاب لوگ فری میسن تنظیم کے رکن ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ تنظیم خفیہ ہے اس لیے اس کی رکنیت کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔فری میسن تنظیم یہود کی حمایت کرتی ہے جبکہ والٹ ڈزنی یہود مخالف یا سامی مخالف (Anti Semantic) مہم کا حصہ رہا ہے اور دوسری جنگ عظیم میں یہود کے خلاف کیے گئے ہٹلر اور نازیوں کے اقدامات کی حمایت کرتا رہا ہے۔ البتہ فری میسن کی طرز کی ایک اور خفیہ تنظیم یا گروہ روزا کروسس (Rosae Crucis) بھی موجود ہے جو قدیم جادو کو سینہ بہ سینہ آگے بڑھانے کا ایک سلسلہ ہے۔اسکا اصل نام قدیم سلسلۂ طلسم روزاکروسس (Antient Mystical Order Rosae Crusis) ہے جسکا مخفف ہے اور یہ تنظیم قدیم علم جادو اور الکیمے کے ساتھ مخصوص ہے۔یہ تنظیم (AMORC) بھی فری میسن کی طرح خفیہ ہے۔ان دونوں تنظیموں میں فرق یہ ہے کہ فری میسن روحانی طور پہ پوشیدہ AMORC مادی طریقے سے اقتدار کی کوشش کرتی ہے جبکہ قوتوں کے ذریعے اسی اقتدار کی

خواہاں ہے۔ یہ وہی جادوئی قوتیں تھیں جن کے ذریعے قدیم مصر میں خوارق کا ظہور کیا جاتا اور لوگوں کو فراعنہ کی عبادت پہ لگایا جاتا۔ بعد میں جب عیسائیت نے اس علاقے پہ اپنا تسلط قائم کیا تو جادوگری ممنوع قرار پائی۔ اس علم کے حامل لوگوں نے خود کو یہودی عیسائی اور بعد ازاں مسلم صوفیہ اور زہاد کے روپ میں پردہ نشین کر لیا اور سترھویں، صدی میں دوبارہ منظر عام پہ آئے۔ جبکہ الکیمے بھی قدیم فلسفے پہ مبنی گروہ ہے جو اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ جادوئی طاقت کے ذریعے کسی بھی عنصر خاص کر دھات کو سونے میں بدلا جا سکتا ہے۔ والٹ ڈزنی بھی اسی سلسلے کا رکن ہے۔ اور ان تصورات کو کارٹون کی شکل میں عام کرتا رہا ہے۔ اور کارٹون کے پیچھے کارفرما جادوئی قوت کا تخیل اس کی توثیق کرتا ہے کہ والٹ ڈزنی کا تعلق اسی خفیہ گروہ سے تھا اور وہ اسکے خیالات و نظریات کی ترویج کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذہن میں ایک نئی دنیا آباد ہوتی ہے اور وہ دنیا کے رازوں کو جاننے کے درپہ ہوتے ہیں۔ وہ انہی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ والٹ ڈزنی نے پہلے کارٹون فلمیں تخلیق کیں پھر اس نے تھیم پارک تخلیق کیا اور بعد ازاں یہی تھیم پارک ویڈیو گیمز کی شکل میں منتقل ہو گیا۔ والٹ ڈزنی کی یہ تخلیقات تعمیر سے زیادہ تخریب کا باعث بنی ہیں۔ اس نے انسانی معاشروں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس کا ہدف خصوصی طور پہ بچے بنے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ بچہ تعمیر شخصیت کے انتہائی اہم مرحلے میں ہوتا ہے۔ انسانی

زندگی کے ابتدائی پانچ برس میں 80% شخصیت مکمل ہو جاتی ہے۔ اس عمر میں بچوں کو تخیل کی دنیا میں لے جانے سے وہ ہمیشہ کے لیے انہی تخیلات کے اثیر ہو جاتے ہیں ۔والٹ ڈزنی کی مصنوعات بچوں کے ناپختہ ذہن میں اپنی تصاویر نقش کر دیتی ہیں جو بعد میں اسکی شخصیت کی بنیاد کا جزو لاینفعک بن کر رہ جاتی ہیں۔ والٹ ڈزنی کی مصنوعات مندرجہ ذیل طریقے سے بچوں کے اذھان کو پراگندہ کرتی ہیں۔

انسان کو اللہ نے فرشتوں پہ فضیلت علم کی بنیاد پہ دی اور یہ علم اسماء الاشیاء ہے یعنی (۱ چیزوں کے نام۔ والٹ ڈزنی کی مصنوعات ایسی چیزوں کے نام بچے کے ذہن میں انڈیل دیتی ہیں جن کا وجود ہی نہیں۔ اس کے ذہن میں ایک فرضی لغت پروان چڑھتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جو اسکی آنکھیں دیکھتی تو ہیں مگر ان کا وجود نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ دیکھ چکا ہوتا ہے وہ اسکے ایمان کا حصہ بن جاتا ہے جبکہ اسے جو بعد میں سکھایا جاتا ہے وہ اسکی عقل قبول نہیں کر رہی ہوتی۔ اس علم کی بنیاد پہ جو شخصیت تعمیر ہوتی ہے وہ عمل کے لحاظ سے مطلوبہ انسان بننے میں مانع ہوتی ہے۔

انسان اپنے گرد و پیش سے سیکھتا ہے۔ وہ اپنے والدین کی طرز معاشرت اختیار کرتا (۲ ہے، اپنے گھر کی بولی بولتا ہے۔ رہن سہن، بود و باش، تہوار، کھیل، زندگی اور موت کے ڈھنگ وہ اپنے معاشرے سے سیکھتا ہے لیکن یہ کارٹون

اور ویڈیو گیمز اسے ایک اجنبی ثقافت سے آشنا کر دیتے ہیں اور مغرب کی چکا چوند کو اس کے ذہن پہ نقش کر دیتے ہیں۔ وہ بچپن سے ہی مغرب کا اثیر ہو جاتا ہے۔ وہ کارٹون اور ویڈیو گیمز کے گرداروں کو اپنے لیے عملی نمونہ بنا دیتا ہے اور اس طرح کا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ویلنٹائن ڈے، کرسمس اور اس طرح کے مغربی تہوارون سے تو آشنا ہوتے ہیں لیکن اپنے ایام اور تہواروں سے بے خبر۔

(۳ کارٹون اور ویڈیو گیمز سے متاثر ہونے والے بچے اخلاقیات سے عاری ہو جاتے ہیں وہ احترام، ایثار اور باہمی امداد کے فلسفے سے دور ہوتے ہیں اور اپنے فائدے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے کی سوچ کا اپنا لیتے ہیں۔ وہ مغرب کی اس سوچ کے اسیر ہو جاتے ہیں کہ ''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے''۔ اس طرح بطے شازشی ذہنیت کے مالک ہو جاتے ہیں۔

(۴ انسان کو جانور سے ممتاز کرنے والی صفت حیاء ہے اور یہ دین کا ایک شعبہ ہے۔ یہ جب تک انسان کا خاصہ ہے وہ جانور سے ممتاز ہے اور جب اس سے حیاء ختم ہو جائے تو انسان ایک جانور رہ جاتا ہے۔ مغرب نے انسان کو جانور کی جدید شکل قرار دیا ہے یا پھر اسے معاشرتی حیوان یا عقلمند حیوان گردانا ہے۔ جبکہ تمام مذاہب اسے ایک مستقل اور جدا مخلوق قرار دیتے ہیں۔ جدید مغربی تہذیب حیاء سے عاری ہے اور اسکے پیش کردہ کارٹون بھی حیاء سے کوسوں دور ہیں۔ وہ جنسی خواہشات اور جذبات کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ ایسے تمام

مناظر جو جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتے ہوں فحاشی کے زمرے میں آتے ہیں۔اور پھر بچوں کے پروگرامات میں ان کو شامل کرنا ان کی ذہنیت کو بے حیائی سے لتھڑنے کرنے کے مترادف ہے۔ بچوں کو جنسی جذبات کی طرف مائل کرنا انتہائی سنگین اخلاقی جرم ہے اور بچوں کی اخلاقیات پہ کھلا ڈاکا۔یہ صریحا مشرقی خصوصاً مسلم معاشروں کو جنسی بے راہ روی کا شکار کرنے کی مذموم کوشش ہے۔

۵) بچے اپنے قومی ابطال (National Heroes) سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور ان کے ذہن میں کارٹون شکل کے ہیرو سما جاتے ہیں۔وہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور ذہنی غلامی کا دروازہ کھلتا ہے۔وہ دوسری تہذیب میں ہی فلاح اور کامیابی تلاش کرتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کوفرسودہ اور بیہودہ خیال کرتے ہیں۔

۶) کارٹون کے ذریعے بڑے سرمایہ دار اپنی تشہیری مہم چلاتے ہیں۔ان کی کمپنیوں کی اشیاء بچوں کے ذہنون میں انڈیل دی جاتی ہیں۔ یہ بچے ذہنی طور پہ اس کمپنی کے اسیر ہو جاتے ہیں اور اسی کے صارف بن کے رہتے ہیں۔

۷) کارٹوں اور ویڈیو گیم انسان کو جانور کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔اس سے تمسخر بھی کیا جاتا ہے۔جو بچے کارٹون دیکھتے ہیں ان کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ کسی کا کارٹوں بنا دیا جائے۔ بلکہ وہ اسے تفریح کا ساماں سمجھتے ہیں۔حالانکہ مغرب نے دنیا کی بڑی بڑی شخصیات کی تصاویر کو مسخ کرنے کے لیے انکے کارٹون بنائے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے عالی مرتبتُ یغمبروں کو بھی نہیں بخشا۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ ہمارے اکابریں کا تمسخر اڑایا جاتا

ہے اور ہم اسے محض تفریح کا نام دے دیتے ہیں۔

۸) سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کارٹون اور ویڈیو گیمز ان بچوں کے ذہنوں سے رحم کا مادہ ختم کر دیتے ہیں۔ ہمدردی اور رحم انسان کا خاصہ ہے لیکن ایک کارٹون اتنا بے رحم ہوتا ہے کہ اپنے علاوہ وہ دوسروں کو اپنی گاڑی سے کچل دیتا ہے کسی کو بھی فائر کرکے مار دیتا ہے پھر بھی وہ ہیرو بن جاتا ہے۔ یہی ذہنیت بچوں میں منتقل ہو رہی ہے اور وہ انتہاء پسند اور شدت پسند ہوتے جا رہے۔ اگر ان بچوں کی مناسب تربیت نہ کی جائے تو یہ مستقبل میں باآسانی دہشت گرد بن جاتے ہیں۔

یہاں سے اہل مغرب کا دوہرا کردار سامنے آتا ہے۔ایک طرف تو انسانی آزادی اور انسانی حقوق کے راگ الاپتے ہیں دوسری جانب وہ اپنی پوشیدہ اور سازشی ذہنیت کے ساتھ دنیا کو ذہنی غلام بنانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ مغربی سرمایہ دار لالچ اور حرص میں اس حد تک اندھے ہو چکے ہیں کہ وہ تمام دنیا کے بچوں سے سوچنے، پرکھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت تک کو ضبط کر لینا چاہتے ہیں۔ایک طرف بچوں کے حقوق کا نعرہ لگاتے ہیں تو دوسری طرف آزادئ اظہار کا۔ جبکہ فی الحقیقت آزادئ رائے کے مورچے سے ایسا مواد نشر کرتے ہیں جو بچوں کو ان کا ذہنی غلام بنا دے۔ آج سے بیس یا پچیس برس پیچھے لوٹ جائیں تو اساتذہ کرام ویڈیو گیم اور کارٹون دیکھنے کے بجائے ورزش، کھیلوں، مطالعہ

کتب، تعمیری مشاغل اور دیگر ہم نصابی سرگرمیوں کی ترغیب دیتے جبکہ آج کے اساتذہ بچوں کو ویڈیو گیم اور کارٹون کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں۔ منطق یہ پیش کی جاتی ہے کہ بچوں کا ذہن تیز ہوتا ہے حالانکہ وہ بد تمیزی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔اگر ان کارٹون اور ویڈیو گیمز کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو ایک ایسی نسل پروان چڑھے گی جو اخلاقیات سے بالکل ناآشنا ہو گی۔ انسان تہذیب کو چھوڑ کر درندگی کی زندگی اختیار کر لے گا۔ہر شخص مشین کی طرح ایک ہی سسٹم سے ایک ہی جگہ سے کنٹرول ہوگا اور یہی دراصل شیطانی اور دجالی قوتوں کا ایجنڈا ہے۔ یہ خفیہ تنظیمیں دراصل دجال کے لیے راہ ہموار کر رہی ہیں۔

اس طوفان بد تمیزی سے نمٹنے کے لیے ہمارے ارباب اختیار نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ارباب اختیار اب تک بے خبر ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا۔زیادہ سے زیادہ میڈیا مالکان نے یہ کیا ہے کہ دیہاتی بچوں کو انگریزی سمجھ نہیں آتی اس لئے ان پروگرامات کو اردو میں ڈب کرکے پیش کیا جائے۔ لیکن انہیں خود ترجمہ کرنے کے بجائے انہوں نے پڑوسی ملک کو یہ فریضہ سونپ دیا ہے اور پڑوسی ملک کی ہندی زبان میں وہی کارٹون اور بچوم کے پروگرامات نشر ہوتے ہیں۔ پہلے تو صرف اخلاقی تباہی تھی اب دشمن ملک کی زبان کو بھی بچوں کے ذہن میں انڈیلا جا رہا ہے۔ غرض اصلاح کے بجائے مزید تخریب کا

سامان اکٹھا کیا جا رہا ہے۔اس ضمن میں ترکی اور عرب ممالک نے اپنی زبانوں میں کارٹون بنائے ہیں جو اخلاقیات پہ مبنی ہیں لیکن ہماری حکومتیں اور میڈیا شاید اصلاح کا ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ وطن عزیز کی کچھ تنظیموں اور اداروں نے اردو میں اخلاقی کارٹون پیش کیے ہیں۔ جن میں اپنے سائنسدانوں، مصلحین، فاتحین اور انصاف پسند حکمرانوں کے کارنامے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک اچھی کاوش ہے اور تربیت کے لیے بہتر مواد بھی فراہم ہوتا ہے۔ لیکن یہ اخلاق پہ مبنی کارٹون اور گیمیں یا تو دکانوں سے خریدنے پڑتے ہیں یا انٹرنیٹ پہ ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔اسی لیے تو اقبالؒ نے فرمایا تھا

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

والٹ ڈزنی اور اس کے پیش روؤں نے جو جنگ ہم پہ مسلط کی ہے اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ اس جنگ میں حتمی فتح کے لیے بہت بڑے منصوبہ عمل کی ضرورت ہے۔ محض کارٹون اور ویڈیو گیم کو اسلامانہ بھی اسکا حل نہیں۔ غیر اخلاقی و غیر اسلامی کارٹون کا مقابلہ کرنے کے لیے اخلاقی بنیادوں پہ بنائے گئے کارٹوں کافی نہیں۔ اس سے بہرحال کارٹوں کی اہمیت ختم نہیں ہوتی بلکہ جڑ پکڑتی ہے۔ کسی ایسی ایجاد کی ضرورت ہے جو بچون اور نوجوانوں کی توجہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی جانب پھیر دے۔ اس حوالے سے ہمارے اہل ذکر و فکر اور اہل ہنر، اہل

قلم ، اہل منبر و محراب اور اہل سیاست افراد کو اس کے توڑ کے لیے کوشش کرنا ہوگی۔ مسلم حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو تباہی کی نذر ہونے سے بچانے کے لیے ٹھوس اقدامات کریں ۔ایسے اقدامات کریں جس کی بدولت ایسی نسل تیار ہو جو اس عالمی فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکے ۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ بچوں کو کارٹون ، ویڈیو گیم اور دیگر پروگرامات دیکھنے میں رہنمائی فراہم کریں اور اخلاقیات سے بھرپور مواد تک ان کی رسائی کو یقینی بنائیں ۔ بچوں اور نوجوانوں کو قرآن اور سنت سے مزیّن کریں ۔ نبی آخر الزماں ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں فرمایا تھا کہ ’’ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک ان سے جڑے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہوگے ۔ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔‘‘ اللہ تعالی ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما کر ہمیں قران و سنت کے مطابق تعمیر انسانیت کی توفیق عطا فرمائے ۔آمین۔